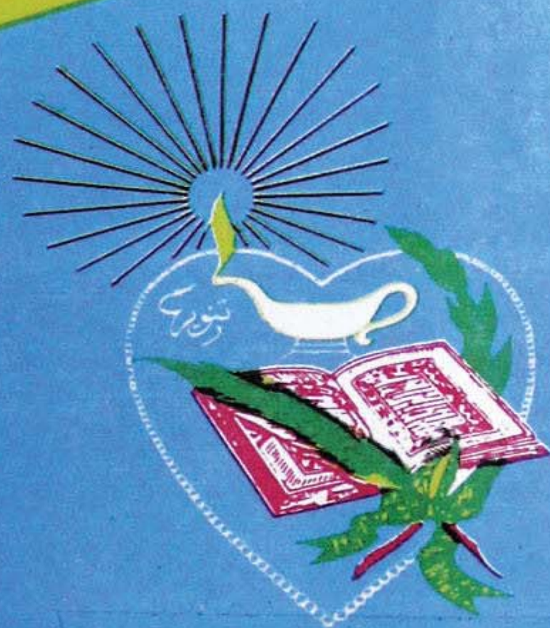
برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت

مسئلہ دار الحرب و دار الاسلام کی ایک نادر علمی تحقیق



مرتب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

برصغیر

پاک و ہند کی شرعی حیثیت

مسئلہ دار الحرب و دار الاسلام کی ایک نادر علمی تحقیق

مرتبہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

مجلس یادگار شیخ الاسلام

قاری منزل، پاکستان چوک، کراچی ۷۴۲۰۰

بر صغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت

مرتب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

ناشر: مجلس یادگار شیخ الاسلام۔ پاکستان

طابع: الحزن پرنٹرز، پاکستان چوک، کراچی۔ 74200

اشاعت: ۱۹۹۳ء

صفحات: ۱۷۲

قیمت: .... روپے

ملنے کے پتے

مکتبہ شاہد

۱/۹ علی گڑھ کالونی۔ کراچی ۷۵۸۰۰

- الجمعیۃ اکیڈمی، محلہ جنگی قصہ خوانی بازار۔ پشاور
- مکتبہ قاسمیہ، اردو بازار۔ لاہور
- کتب خانہ رشیدیہ، مدینہ مارکیٹ۔ راولپنڈی
- مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ۔ کوئٹہ
- کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ۔ ملتان
- مکتبہ بنوریہ، نیو ٹاؤن۔ کراچی

مکتبہ رشیدیہ

قاری منزل، مرار اسٹریٹ، پاکستان چوک، کراچی ۷۴۲۰۰

فہرست

دیباچہ

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

کسی ملک کے باشندوں کے لیے ان کے ملک کی دستوری اور قانونی حیثیت بنیادی اہمیت رکھتی ہے ۔ملک کی قانونی (شرعی) حیثیت ہی اس قوم کے فلسفۂ حیات کی روح ، اس کے اخلاق کی بنیاد، اس کے فکر کا محور، اس کے عمل کا محرک اور اس کے اشتراک واتحاد کی اساس ہوتی ہے ۔یہی چیز وطن سے عشق کا وسیلہ بنتی ہے اور یہی عشق وطن کی آزادی اور اس کے دفاع کے لیے سرفروشی اور جان نثاری کا جذبہ پیدا کرتا ہے ۔ یہ جذبہ جب پیدا ہوتا ہے تو اسے خاکِ وطن کا ہر ذرہ قابل پرستش اور دیوتا نظر آنے لگتا ہے ۔اگر کسی قوم میں یہ جذبہ پیدا نہ ہو تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے نہ تو اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالتی ہے ، نہ اس میں وطن کے دفاع کے لیے سرفروشی کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور نہ وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے کوئی کارنامہ انجام دیا جاسکتا ہے ۔

برصغیر پاک وہند کی تاریخ سیاسی پر نظر ڈالیں تو ہمیں صاف نظر آجاتا ہے کہ جو اہل ملک اور خصوصاً مسلمان برٹش حکومت کو غاصب اور ملک کو دارالحرب سمجھتے تھے وہی آزادی کی تحریک کے رہنما تھے ۔جن حضرات کے نزدیک مغلیہ عہدِ حکومت اور برٹش عہدِ استعمار میں ملک کی قانونی اور شرعی حیثیت میں کوئی فرق نہ تھا اور جن کے نزدیک برطانوی عہد میں بھی برصغیر بہ دستور دارالاسلام ہی رہا تھا، ان کا ملک کی آزادی یا پاکستان کی تحریک سے کچھ تعلق نہ تھا۔

اس حقیقت کا پہلا آشنا وہ تھا جس نے لیلیٰ وطن کی غلامی کی صبح کو اس کی

حیثیت کی طرف اشارہ کیا تھا، اس فکر اور جذبے کو قانون کی زبان عطا کی تھی اور ملک کی دارالاسلام سے دارالحرب میں تبدیلی کی طرف اشارہ کر کے تحریکِ آزادی اور استخلاص وطن کے لیے سعی و جہد کا جواز فراہم کیا تھا۔ اسی مقام پر جہادِ وطن کے لیے پہلا قافلۂ شوق تیار ہوا تھا اور حریت و استقلال وطن کے لیے ایثار و قربانی کا شوق فراواں پیدا ہوا تھا۔ حقیقت کے پہلے آشنا سے میرا اشارہ حکیم الہند شاہ عبدالعزیز دہلوی کی طرف ہے۔

تحریکِ پاکستان کی محرک اور مجوز بھی کوئی چیز تھی تو وہ یہی کہ ملک دارالحرب ہو گیا تھا۔ ورنہ اگر مغلیہ عہدِ سلطنت ہی کی طرح برٹش دورِ حکومت میں بھی ملک بدستور دارالاسلام تھا تو پاکستان کے لیے تحریک اور اس کے قیام کا کیا جواز تھا۔ دارالاسلام کو ترک کر کے کیا بنایا؟ اگر نظریۂ پاکستان کے اولین رہنما سرسید کے بقول انگریزی حکام اولوا الامر منکم میں شامل تھے اور ان کی اطاعت مثل اطاعت خدا اور رسولؐ کے مسلمانوں پر واجب تھی اور ملک اس وقت بھی دارالاسلام (اسلام کا گھر اور قلعہ) تھا تو اس دارالاسلام سے روگردانی کو اسلام سے ارتداد اور اسلامی حکومت سے بغاوت سے کم تر درجے کی چیز قرار دیا جا سکتا ہے؟

تحریکِ آزادی کا کارواں اور تحریکِ پاکستان کا قافلۂ شوق تاریخ کے مختلف نشیب و فراز سے گزر کر آزادی کی منزل تک پہنچا ہے۔ اس سفر کے کئی مرحلے اور ہر مرحلے کی متعدد منازل ہیں؛

پہلا مرحلہ وہ تھا جب مسلمانوں نے اپنی ہی قوت بازو سے اہل وطن کو آزادی کے ساحل مراد تک پہنچا دینے کا عزم کیا تھا۔ یہ مرحلہ تاریخ تحریک آزادی کے پہلے پچاس سالہ دور پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مرحلے کا آغاز ۸-۱۸۰۷ء میں ہوتا ہے جب حضرت شاہ عبدالعزیز نے ملک کی قانونی حیثیت کے بارے میں دو ٹوک الفاظ میں اس کے

دارالحرب ہو جانے کا فتویٰ دیا تھا۔ یہ دور ۱۸۵۷ء میں تحریکِ آزادی کی ناکامی پر ختم ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں تمام مساعی اور جدوجہد کا مقصد مغلیہ قومی حکومت کا احیا رہا تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد قافلۂ حریت کے سامنے ملکی قومی جمہوری حکومت کا نصب العین نمایاں ہوتا چلا گیا۔ یہ تحریکِ آزادی کے سفر کا دوسرا مرحلہ تھا۔

پہلے مرحلے کے منازل میں حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کی دعوتِ اصلاح (۱۸۱۶ء) اور انقلابی تحریک میں اس کی تبدیلی (۱۸۲۱ء)، تحریک جہاد کی ناکامی (۱۸۳۱ء) اور تحریک استخلاص وطن (۱۸۵۷ء) کے واقعات وحوادث پیش آئے تھے

دوسرے مرحلے کے منازل دارالعلوم دیوبند کا قیام (۱۸۶۷ء)، انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل (۱۸۸۴ء)، جمعیتہ الانصار (دیوبند) کا قیام (۱۹۰۹ء)، تحریکِ خلافت کا آغاز اور جمعیت علماے ہند کا قیام (۱۹۱۹ء) اور اس دوران میں کئی اور قومی وملکی تحریکات کی صورت میں نمایاں ہوئی تھیں۔

اسی دوران میں استعمار پرستانہ تحریکات بھی پیدا ہوئیں۔ سرسید کی ایجوکیشنل کانفرنس (۱۸۸۵ء) اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (۱۸۸۸ء) نیز مسلم لیگ کا قیام (۱۹۰۶ء) اس سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اس کے ساتھ علی گڑھ کے اہل نظر، بریلی، فرنگی محل، (لکھنو) اور بدایوں کے علما، اہل حدیث کی ایک جماعت اور دیوبندی مکتبۂ فکر کی خانقاہی جماعت اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں تھیں۔ یہ رجعت پرستانہ مراکز اور جماعتیں اپنے اپنے دائروں میں اگرچہ موثر نظر آتی ہیں لیکن دیوبند کی انقلابی جماعت اور کانگریس کی ملکی اور قومی تحریکات کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ان کے بہترین دماغ متاثر ہو کر رجعت پرستانہ تحریکات سے الگ اور دیوبند کی انقلابی جماعت اور کانگریس کی قومی تحریکات میں شامل ہوتے رہے۔

اگرچہ یہ قوتیں تحریکِ آزادی وطن کو روکنے اور کانگریس اور جمعیت علماے

ہند کے پیش نظر مقاصد سے انھیں ہٹانے میں یکسر ناکام رہیں، لیکن ہندوستان کی تاریخ سیاسی کا ایک مسئلہ ایسا بھی تھا جس میں تنگ نظری یا عدم بصیرت یا اس کی اہمیت کے عدم ادراک نے ملک کی تاریخ کو یکسر پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ مسئلہ ملک کا ہندو مسلم یا فرقہ وارانہ مسئلہ تھا۔ اول تو متحدہ قومیت کا جوش اس مسئلے کے فہم وادراک میں مانع رہا اور اگر کسی درجے میں اس کا اعتراف کیا بھی گیا تو اس کی اہمیت کو نہ سمجھا گیا اور اس کے حل کی طرف پوری توجہ نہ دی گئی۔ مسلم لیگ کی قراردادِ لاہور اور پاکستان کی تحریک کے پس منظر میں سب سے اہم یہی مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ تحریکِ آزادی کے آغاز ہی سے موجود تھا۔ برٹش استعمار نے اسے ہوا دی تھی، رجعت پسند تحریکوں اور جماعتوں نے اسے ملک کا پہلا اور سب سے اہم مسئلہ بنا کے اسے عوام کے جوش وجذبات کے حوالے کر دیا تھا اور لیڈروں نے قسم کھالی تھی کہ اب وہ کسی وضاحت، یقین دہانی اور وعدے سے مطمئن اور کسی فیصلہ وقرارداد سے متفق نہ ہوں گے۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی قرارداد اور فیصلے سے متفق نہ ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ ایک فریق کی تنگ نظری اور اس مسئلے کی قرار واقعی اہمیت نہ سمجھنے کی غلطی تھی۔

یہ ایک قطعی غیر فرقہ وارانہ مسئلہ تھا۔ اس میں مذہبی جذبات کو استعمال کیا گیا تھا۔ اس میں مذہبی زبان، ایک خاص اسلوب اور شرعی قسم کے استدلال سے بھی کام لیا گیا تھا، لیکن کوئی خاص زبان واسلوب اور استدلال مسئلے کی اہمیت اور نوعیت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ پاکستان کے قیام کا مسئلہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک قطعاً سیاسی مسئلہ تھا اور اس کا ایک خاص سیاسی پس منظر تھا۔

اس مسئلے پر ایک اور طرح سے غور فرمائیے کہ آیا مسلم لیگ ایک مسلمان اور اسلامی جماعت تھی یا ایک قومی جماعت؟ اگرچہ بانی تحریک پاکستان اور مسلم لیگ

کے دورِ آخر کے صدر نے مسلم لیگ کے اندر اور تحریک کے دوران میں اس بحث کو اٹھنے نہیں دیا۔ لیکن یہ تو ایک حقیقت ہے کہ مسلم لیگ میں غیر مسلم شامل، اور اس کے صدر بھی ہوئے تھے نیز تحریکِ پاکستان میں سرگرم تھے۔ بالآخر ۱۹۷۴ء میں لیگیوں کو بھی اپنی تمام آزاد خیالیوں اور نہ چاہنے کے باوجود یہ تسلیم کر لینا پڑا کہ قادیانی دائرہ اسلام میں داخل نہیں۔ احناف اور اہل حدیث کے نزدیک تو عقائد کا دائرہ اس سے بہت تنگ ہے۔

پاکستان کے مطالبے کی اصل نوعیت یہ ہے کہ تقسیم ملک کی تجویز اور قیام پاکستان کا مطالبہ کسی اسلامی عقیدے پر مبنی نہ تھا بلکہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک سیاسی حل تھا۔ جسے غیر مسلموں کی تائید بھی اسی طرح حاصل تھی جس طرح مسلمانوں کی۔ پھر کوئی ایسی سیاسی تجویز اسلامی تجویز کیوں کر ہو سکتی ہے۔

ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے حل کے لیے زیادہ سے زیادہ تقسیم ملک کی ایک سو پینتالیس تجاویز سامنے آئی ہیں۔ ان میں سے چالیس غیر مسلم افراد، ادارے یا جماعتیں ہیں، جن میں ہندو، عیسائی اور قادیانی شامل ہیں۔ کیا ان غیر مسلموں نے اس تجویز کی اس لیے تائید کی ہو گی کہ اس تجویز کے مطابق اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آ رہا تھا یا یہ تجویز مسلمانوں کے مفاد میں تھی؟ ایسا تو نہ تھا کہ انھوں نے تجویز کے آئینے میں اپنے مفاد کی شکل دیکھ لی تھی۔ بالفرض اس میں مسلمانوں ہی کا مفاد تھا اور اس سے اسلامی نظام حکومت کا قیام ہی مقصود تھا تو ہمیں ہندو مہاسبھا، اس کے صدر و سیکریٹری، دوسرے ہندوؤں، عیسائیوں اور قادیانیوں کا ان کی اسلام دوستی، مسلم مفادات کے حصول اور قیام پاکستان کی تحریک میں ان کی تائید کے لیے شکر گزار ہونا چاہیے اور اگر یہ ہندوستان کے سیاسی فرقہ وارانہ مسئلے کا محض ایک حل تھا جسے بلا تخصیص عقیدہ و مذہب اہل ملک کی ایک کثیر تعداد نے پسند کیا تھا تو ان اصحابِ فکر اور

علماے دین کو اسلام دشمن، ملت فروش، اور ہندو کا ایجنٹ کہنے کا کیا جواز تھا، جنھوں نے اس تجویز کو فرقہ وارانہ مسئلے کا صحیح حل نہ سمجھا تھا اور ان کے نزدیک یہ تجویز مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے بھی خلاف تھی؟

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں کانگریس اور لیگ دو قومی جماعتیں تھیں کانگریس میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور اس میں دیگر قوموں اور مذہبوں کے لوگ شامل تھے، وہ ہندو جماعت نہ تھی۔ مسلم لیگ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس میں غیر مسلم شریک تھے۔ اس کے نام میں "مسلم" کے سوا کچھ بھی مسلم نہ تھا۔ کانگریس اور لیگ کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ جماعتیں تھیں۔ ان میں کچھ استعمار دشمن تھیں، جنھیں ہم انقلابی کہہ سکتے ہیں اور کچھ رجعت پرست اور استعمار کی آلہ کار یا نہ جانتے بوجھتے استعمار کے مقاصد کو فائدہ پہنچانے والی جماعتیں تھیں۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت بیجا نہ ہوگی کہ بعض جماعتیں آزادی پسندی اور استعمار دشمنی میں کانگریس کی معاون جماعتوں کی حیثیت رکھتی تھیں اور خواہ مذہبی ذوق رکھنے والے انھیں پسند نہ کریں، لیکن ان کی حیثیت قومی سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ میرا اشارہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں کی طرف ہے۔ لیکن ان دونوں پارٹیوں میں بھی ایک بین فرق کو نظرانداز نہ کر دینا چاہیے۔ سوشلسٹ پارٹی کی سوچ ملکی تھی وہ صرف ہندوستان میں آئندہ اقتصادی اور معاشی نظام کے بارے میں اپنا خاص فکر اور نقطۂ نظر رکھتی تھی۔ اس کے رہنما اور ارکان مذہبی ذوق رکھنے والے نہ تھے، لیکن مذہب کے منکر اور دشمن بھی نہ تھے۔ اس کے برعکس کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی اور اقتصادی فلسفے کی بنیاد مذہب کی نفی پر تھی۔ اس کا آئیڈیل ملک سے باہر تھا، وہ برصغیر کے مخصوص حالات، اس کے باشندوں کے ذوق ورجحان اور مذہب پسندی کے

خصوصیات کو نظرانداز کر کے کمیونزم فلسفے کے مطابق انقلاب لانا چاہتی تھی ۔۔ پھر اس
بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ برصغیر کی سیاسی تاریخ کے نہایت نازک لمحات
میں اس نے اپنے جماعتی اور سیاسی کیریکٹر کا ثبوت نہیں دیا اور عقیدے کے بالکل
برعکس لیگ میں شامل ہو کر مذہبی نعرے بازی کی سیاست کو اختیار کر لیا ۔ جب اس
نے سیاست کا یہ انداز اختیار کیا تھا تو وہ جان بوجھ کر مسلمانوں کو یا مسلم لیگ کو
دھوکا دے رہی تھی ۔

ہندوستان کی سیاسی اور ملی تاریخ میں جمعیت علماے ہند کو خاص اہمیت
حاصل رہی ہے ۔ اس کا وجود " علما کی اسمبلی " سے ہرگز مختلف نہ تھا ۔ جمعیت علماے
ہند مختلف مکاتب فکر کے علما کا سب سے بڑا اتحاد تھا ، جس میں حنفی ، اہل حدیث ، لکھنو
بدایوں ، اجمیر ، دیوبند وغیرہ کے حنفی علما کے تمام مقتدر خانوادوں کے علما شامل تھے
برصغیر کی تاریخ میں علما کا اس سے بڑا اتحاد کبھی قائم نہیں ہو سکا ۔ جمعیت علماے ہند
" علما کی کونسل " تھی ، جس کے قیام کی آرزو کا علامہ اقبال نے خواب دیکھا تھا ۔ اگرچہ
رفتہ رفتہ مقامی اور صوبائی سطح کی جمعیتیں قائم ہو گئی تھیں اور اس کے مقابلے میں
بھی انجمن علما یا جمعیت علما کا قیام عمل میں لایا گیا ، لیکن جمعیت علماے ہند کی مرکزی
حیثیت اور اس کی دینی اور سیاسی اہمیت میں فرق نہیں پڑا ۔ اس کا سیاسی اور مذہبی کردار
روز بہ روز نمایاں ہوتا گیا ۔

آزادی سے قبل جمعیت علماے ہند کی جدوجہد کے کئی اہم اور بڑے دائرے
تھے ؛

ا .... آزادی کے لیے جدوجہد ۔ اس کے لیے اس نے اپنے پلیٹ فارم سے تحریک چلائی اور
دوسری قومی اور ملی انقلابی جماعتوں سے اشتراک عمل بھی کیا ۔

۲ ـــ مسلمانوں کی ملی ضروریات کا انتظام مثلاً ؛ مذہبی تعلیم، تبلیغ واشاعت اسلام، اصلاح ملی، تنظیم واتحاد بین المسلمین، قیام مدارس دینیہ، تنظیم مساجد، اوقاف کا انتظام وغیرہ۔

۳ ـــ دستوری مطالبات اور قانون سازی کے میدان میں جدوجہد۔ اس سلسلے میں شاردا ایکٹ، سول میرج ایکٹ، قاضی بل، شریعت بل، خلع بل اور مسلمانوں کے پرسنل لا کے سلسلے میں مطالبات، تحفظات، انتظامات وغیرہ

۴ ـــ اس کی خدمات کا ایک اہم میدان بین الاسلامی سیاسی خدمات بھی ہیں۔ اگرچہ جمعیت علماے ہند کے دیوبندی اکابر بہت پہلے سے اس میدان میں سرگرم عمل تھے اور اپنے ایثار اور قربانی کا نقش جمیل تاریخ کے صفحات پر ثبت کر چکے تھے، لیکن جمعیت علماے ہند کے قیام کے بعد ان کوششوں نے زیادہ منظم شکل اختیار کر لی تھی۔ ان کوششوں میں افغانستان، ایران، مصر، ترکی، عراق وشام، عربستان، حبشہ، مراکش، الجزائر وغیرہ کی آزادی کی تحریکوں، ان مملکتوں کے حدود اور ان کی قومی حکومتوں کے قیام اور حفظ وبقا کی کوششوں اور ان کے خلاف استعماری سازشوں کو ناکام بنانے میں جمعیت نے تحریکیں چلائیں اور اس سلسلے میں اس کے سیکڑوں رہنما اور ہزاروں کارکن جیلوں میں گئے۔

ان مختلف دائروں میں جو جمعیت علمائے ہند کی خدمات کے نہایت جلی عنوانات ہیں، اس کے مساعی اور قربانیوں کا ابھی تک جدید علمی انداز میں کوئی تذکرہ مرتب نہیں ہوا کہ مقامی اور ملکی سطح سے لے کر بین الاسلامی اور بین الاقوامی سطح تک اس کی خدمات کا قرار واقعی اندازہ کیا جاسکے۔ میں خود بھی اس وقت اس بحث کو اس سے آگے نہیں لے جاسکتا۔ میں اس وقت جمعیت کی صرف ان کوششوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو اس نے ملک کی تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ دستوری اور قانون سازی کی سطح پر کی ہیں۔

جمعیت علماے ہند نے اپنی زندگی کے آغاز ہی میں اندازہ لگا لیا تھا کہ ملک کا آئندہ جو دستور بھی بنے گا، وہ جمہوری بنیادوں پر بنے گا۔ ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی کی ناکامی نے مغلیہ حکومت کے احیا یا کسی قسم کی مسلمان حکومت کے قیام کو خارج از امکان قرار دے دیا تھا۔ سیاسی بصیرت کا تقاضا یہ تھا کہ قوم کو آئندہ کسی نئے غلبہ واستبداد سے بچایا جائے اور ملک میں ایسی دستوری اور جمہوری حکومت کا قیام ممکن بنایا جائے جو مسلمانوں اور ملک کی دیگر اقلیتوں کے اجتماعی مفاد کے خلاف نہ ہو۔ یہ نقطۂ نظر صرف جمعیت علماے ہند ہی کا نہ تھا، بلکہ تمام ملی انقلابی جماعتوں، مسلمان کانگریسیوں اور آزاد خیال اور نیشلسٹ مسلمانوں کا بھی یہی خیال تھا۔ اگرچہ اس جدوجہد میں بہت مشکل مقام آئے اور ۱۹۳۷ء خصوصاً ۱۹۴۰ء کے بعد مسلم لیگ کے فرقہ وارانہ وانتہا پسندانہ اندازِ سیاست نے تو اس منزل کو بہت دور کر دیا تھا جب کہ مسلم لیگ کے صدر نے ایک بیان میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہمیں پاکستان دے دو اور ہندوستان میں تم بہ خوشی ہندو راج قائم کر لو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انڈونیشیا اور پاکستان کے بعد دنیا کی تیسری بڑی مسلمان اکثریت کو، جو ایک خطۂ زمین اور ایک ملک کی سرزمین میں آباد تھی، کسی نئے دستوری یا سیاسی استبداد کے حوالے نہیں کیا جاسکتا تھا(۱)۔ جمعیت علماے ہند نے شروع ہی سے اپنے دستوری نصب العین کا تعین کر لیا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اسی نصب العین کو پالینے کی جدوجہد میں مصروف رہی۔

---

(۱) ـــ انڈونیشیا دنیا کا سب سے بڑا مسلمان ملک ہے لیکن اس کی آبادی تیرہ کروڑ سے زیادہ نہیں بنگلہ دیش کی آبادی بارہ کروڑ اور پاکستان کی آبادی دس کروڑ سے زیادہ نہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا دعوا ہے کہ ان کی تعداد بیس کروڑ یا اس سے زیادہ ہے۔ جب کہ راجیو حکومت نے تقریباً سولہ کروڑ آبادی تسلیم کر لی تھی۔ اس لیے مسلمان آبادی کا سب سے بڑا ملک، جہاں مسلمان آزاد اور حکومت کے کاروبار میں برابر کے شریک ہیں، ہندوستان ہے۔

جمعیت کی تاریخ میں ہمیں سب سے پہلے ۱۹۲۳ء میں اس کا سراغ ملتا ہے۔ جب اس نے لالہ جیت رائے اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مرتبہ "میثاق ملی" کو اپنے مقاصد سے قریب پاکر اس پر اظہار رائے کیا تھا۔ یہ میثاق ملی کانگریس کی ایک سب کمیٹی نے تیار کیا تھا اور ستمبر ۱۹۲۳ء میں خصوصی اجلاس کانگریس منعقدہ دہلی کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد کے فیصلے کے مطابق چھاپ کر مختلف جماعتوں کو بھیجا گیا۔ اس میثاق ملی کی ایک شق میں کہا گیا تھا:

> "تمام ملتوں کو جن سے قوم ہند مرکب ہے، کامل مذہبی آزادی یعنی آزادی عقائد، عبادت، تبلیغ، اجتماع اور تعلیم حاصل ہوگی اور یہ آزادی ایک ایسا آئینی حق ہوگا جس کی ترمیم، تنسیخ، معطلی یا اس میں کسی نوع کی مداخلت کسی حکومت کے لیے جائز نہ ہوگی۔ (جمعیت علما کیا ہے؟، لاہور۔ ص ۱۶۹)

اگرچہ پورے میثاق ملی پر غور کرکے آخری رائے دینے کے لیے جمعیت علماے ہند نے نو (۹) اہل علم اور اصحاب فکر و نظر کی ایک سب کمیٹی بنادی تھی لیکن مذکورہ بالا شق کو پسند کیا گیا۔

۱۹۳۱ء میں جمعیت علماے ہند نے خود اپنا ایک فارمولا پیش کیا، جس کی پہلی شق یہ تھی:

> "ہندوستان کی مختلف ملتوں کے کلچر، زبان، رسم الخط، پیشہ، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی ادارے، مذہبی عقائد، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف آزاد ہوں گے۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔"
>
> (جمعیت علما کیا ہے؟، لاہور۔ ص ۲۷۴)

۱۹۴۲ء میں پھر ایک قرارداد میں جمعیت علماے ہند نے اپنے دستوری نصب العین کو پوری طرح واضح کیا اور کہا:

> "وطنی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے۔ ان کا مذہب آزاد ہوگا، مسلم کلچر اور تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو ہرگز قبول نہ

کریں گے جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔"

(جمعیت علما کیا ہے؟، لاہور۔ ص ۳۴۳)

یہی مطالبہ جمعیت علمائے ہند نے اپنے چودھویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۴۔ مئی ۱۹۴۵ء بہ مقام دہلی میں دہرایا اور اس میں مندرجہ ذیل مزید ایک شق کا اضافہ کیا:

"مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی ۳ / ۲ اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب وثقافت پر مخالفانہ اثر انداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش یا پاس نہ ہو سکے گی۔"

(جمعیت علما کیا ہے؟، لاہور۔ ص ۳۶۳)

کانگریس اپنے آغازِ قیام ہی سے ایک قومی جماعت کی حیثیت سے ملکی اور قومی مفادات اور غیر فرقہ وارانہ بنیاد پر ملک کی تعمیر کے لیے سرگرم عمل تھی۔ اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں ملک کے لیے ایک جمہوری اور غیر مذہبی (seculer) دستور کے باب میں اپنے نصب العین کا اعلان کرتی رہی تھی، سب سے پہلے اس نے اپنے پینتالیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی (۲۹۔ مارچ ۱۹۳۱ء) میں بنیادی حقوق کے بارے میں ایک قرارداد پاس کی۔

(دوبارہ) سینتالیسویں اجلاس منعقدہ کلکتہ (اپریل ۱۹۳۳ء) میں بنیادی حقوق وفرائض اور معاشی پروگرام پر ایک جامع قرارداد پاس کی گئی۔ اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں سر تیج بہادر سپرو کے زیر صدارت ایک کمیٹی میں بنیادی حقوق کا مسئلہ زیر بحث آیا کہ مستقبل کے ہندوستانی آئین میں اسے کیا جگہ دی جائے؟ اس قرارداد نے پہلی مرتبہ شہری حقوق اور معاشی حقوق میں امتیاز کیا۔ شہری حقوق کو عدالت کے ذریعہ نافذ کیا جا سکتا ہے، جب کہ معاشی حقوق کو عدالت کے ذریعے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلے میں کمیٹی نے سوشل ماحول اور معاشی حالات کو تبدیل کرنے کے لیے مثبت انداز میں منصفانہ قانون سازی اور دستور میں دونوں قسم کی دفعات کو جگہ

دینے کے لیے سفارش کی۔

(Federal India : A Design for Change, by Rasheeduddin Khan, New Delhi (India), 1992, P.70)

۱۹۴۵ء میں کانگریس نے اپنے انتخابی منشور میں ایک بار پھر اپنے مقاصد اور مستقبل میں ملک کے سیاسی نظام کے بارے میں اپنے نصب العین کا اعادہ کیا اور ملک کے عوام کو یقین دلایا:

" اب جب کہ گاندھی جی کی قیادت میں عدم تشدد کے ذریعے سیاسی آزادی حاصل کی جاچکی ہے نیشنل کانگریس کا فرض ہے کہ وہ سماجی اور معاشی آزادی کے لیے جدوجہد کرے، تاکہ ہندوستان کے تمام لوگوں کے لیے بلالحاظ نسل ومذہب یکساں مواقع فراہم ہوں۔ یہ مقصد ایک نئے اور مثبت طریق کار اور مادرِ وطن کی خدمت کے لیے تعمیری اسپرٹ کا متقاضی ہے۔

ہندوستان کے عوام نے آزادی حاصل کر لی ہے، لیکن اس کے ثمرات سے مستفیض ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریاں بھی ادا کریں۔ کانگریسیوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ عوام کی خدمت ان کا نصب العین رہا ہے اور اب بھی ہے اس لیے وہ بھی اپنے فرائض اور ذمہ داریاں نبھائیں۔...

ہندوستان کے لوگوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنا۔... طبقاتی فرق مٹا دینا، جو پیدائش، فرقے یا مذہب کی بنا پر ہے، سب سے بڑی خدمت ہے۔ ایسا کرکے غیر طبقاتی جمہوری سوسائٹی قائم کی جاسکے گی اور سب سے بڑھ کر اخلاقی اقدار کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا ہر قیمت پر خاتمہ کرنا ہے۔

(Selected Works of Maulana Abul Kalam Azad, Edited by Dr. Ravindra Kumar, Vol.3, New Delhi (India) 1991, P.280)

اس کے باوجود کہ ملک کی تقسیم نے جمہوری غیر مذہبی دستور کی منظوری اور

نفاذ میں بہت مشکلات پیدا کر دی تھیں ۔ لیکن جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں ، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے آزاد خیال اور نیشنلسٹ رہنماؤں نے کانگریس کو اپنی اعلان کردہ پالیسی سے ادھر ادھر ہٹنے نہیں دیا اور انھیں رہنماؤں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ آزاد ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے اپنے ابتدائی ایام ہی میں دستور کی نوعیت کے بارے میں صاف صاف اعلان کر دیا کہ اس کی حیثیت سیکولر (غیر مذہبی) ہوگی ۔

کانگریس کی قراردادوں کے مطابق ۱۹۴۷ء کے شروع ہی میں دستور سازی کا کام شروع کر دیا گیا تھا ۔ اولاً دستور ساز اسمبلی نے دستور سازی کے رہنما اصول طے کر کے ڈاکٹر بی ۔ آر ۔ امبیدکر کی صدارت میں ایک ڈرافٹنگ کمیٹی بنا دی ۔ ۴ ۔ نومبر ۱۹۴۸ء کو اس نے پہلا مسودہ قانون دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کر دیا اور اس کی ہدایات کی روشنی میں ترمیم و اصلاح کے بعد دستور کو آخری شکل دے دی گئی ۔

" ۲۶ ۔ نومبر ۱۹۴۹ء تک اسمبلی کا کام جاری رہا ۔ مجلس دستور ساز نے دو سال گیارہ ماہ اٹھارہ دن میں بھارت کا دستور بنایا ۔ اس دستور بنانے پر حکومت کا ۶۴ لاکھ روپے خرچ آیا ۔ یہ دستور ۲۲ حصوں میں مرتب ہوا ۔ اس دستور کی رو سے آزاد بھارت اعلیٰ اختیار رکھنے والا غیر مذہبی جمہوری اور دولت مشترکہ کا ممبر بن گیا ۔

(مولانا آزاد --- ایک سیاسی ڈائری ، مرتبہ : اثر بن یحییٰ انصاری ، ص ۴۴۴)

" ڈاکٹر امبیدکر دستور بنانے والی کمیٹی کے صدر تھے ۔ دستور کے شروع میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ہم باشندگان ہند نے اپنے ملک کو ایک مکمل اور موثر جمہوری مملکت بنانے ، اس کے تمام شہریوں کو اقتصادی اور سیاسی انصاف حاصل کرنے ، اظہارِ خیالات ، عقیدہ ، مذہب اور عبادت کی آزادی عطا کرنے ، سب کو یکساں معاشی مواقع حاصل کرنے ، نیز ان میں شخصی وقار اور قومی اتحاد قائم کرنے اور اخوت بڑھانے کے واسطے ہندوستان کو آئینی طور پر ایک اعلیٰ جمہوریت میں تشکیل دینے کے لیے مستحکم

ارادہ کرکے اپنی اساسی دستور ساز اسمبلی میں اس آئین کو دل سے قبول اور منظور کرتے ہیں ۔اس طرح یہ آئینی اور غیر مذہبی دستور منظور ہو گیا۔"

(حسرت موہانی ۔۔۔ایک سیاسی ڈائری، مرتبہ: اثر بن یحییٰ انصاری، ص ۲۷۹)

دستور کی منظوری کے کامل دو ماہ کے بعد ۲۶ ۔جنوری ۱۹۵۰ء کو ملک میں یہ دستور نافذ کر دیا گیا۔

"۲۶ ۔جنوری ۱۹۵۰ء کو خود مختار ہندوستان اور غیر مذہبی آئینی دستور کا نفاذ ہونے پر ہندوستان کے پہلے صدر بابو راجندر پرشاد چنے گئے اور وزیر اعظم کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال نہرو کا از سر نو انتخاب عمل میں آیا اور ان کی نئی کابینہ نے حلف اٹھایا۔ سارے ملک میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے ۔اس طرح ہندوستان نے اپنی مکمل آزادی اور غیر مذہبی جمہوری نظام کے قیام کا اعلان کر دیا۔"

(مولانا آزاد ۔۔۔ ایک سیاسی ڈائری، ص ۴۴۶)

ڈاکٹر رشید الدین خان (دہلی) لکھتے ہیں:

" موجودہ ہندوستانی ریاست ایک عظیم الشان تاریخی جدو جہد کے بعد وجود میں آئی ہے ۔ یہ شہریوں کا ایک اشتراک (Association) ہے، جس میں ہر شہری برابر اور آزاد ہے اور ذات، عقیدہ، رنگ، نسل، زبان، علاقہ، سکونت (Domicile)، مرتبے کے امتیاز کے بغیر مساوی حیثیت میں اس کا رکن ہے ۔ہندوستانی ریاست نہ تو مذہبوں کا وفاق ہے اور نہ مذہبی فرقوں کا مجموعہ ہے ۔ ہندوستان کے تمام شہری قانونی اور آئینی اعتبار سے ایک عام متحدہ قومی معاشرتی ریاست کے عناصر ترکیبی ہیں ۔"

" موجودہ ریاست کی بنیاد ایک دستور ہے جو بنیادی، غیر مذہبی (Secular) اور انسانی ہاتھوں کا بنایا ہوا ہے ۔ اس لیے ایک اسٹیٹ کو اسٹیٹ کے طور پر اور ایک سیکولر اسٹیٹ کو سیکولر اسٹیٹ کے طور پر کام کرنا چاہیے ۔ نہ اس سے کچھ کم، نہ اس سے کچھ زیادہ ۔"

(Federal India : by Dr. R.D. Khan, P.70)

جب تک ہندوستان نے اپنے غیر فرقہ وارانہ، جمہوریہ اور سیکولر ہونے کا اعلان اور اس کے بعد دستور نافذ نہیں کر دیا، ہندوستان کی اقلیتیں، خصوصاً مسلمان ایک سخت بے چینی میں مبتلا رہے تھے۔ دستور کے نفاذ کے بعد انھیں ہندوستان میں اپنی حیثیت اور اپنے مذہب، تہذیب، پرسنل لا کی طرف سے اطمینان ہوا۔ اگرچہ اب بھی انھیں تنگ نظری، فرقہ پرستی، تعصبات کا سخت سامنا ہے، لیکن ہندوستان کا غیر فرقہ وارانہ غیر مذہبی دستور ان کے لیے ایک ڈھال ہے۔

ہندوستان کے دستور کے سلسلے میں سیکولر اسٹیٹ کے لفظ نے مذہبی ذوق رکھنے والوں کو متوحش کر دیا تھا۔ لیکن جب دستور میں سیکولر اسٹیٹ کا لفظ استعمال کیا جارہا تھا تو یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ ہندوستان میں سیکولر ازم مذہب کے خلاف اندازِ فکر پر منطبق نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق صرف عقیدے اور ضمیر کی آزادی سے ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان میں ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہے۔" ہندوستانی نقطہ نظر سے سیکولر ازم کی دوسری تعریف یہ کی گئی ہے کہ ہندوستانی سیکولر ازم کا مطلب ہے؛

"تمام مذاہب کی یکساں عزت۔" (Federal India ---- P.72)

اور یہ کہ

"تمام مذاہب کے معاملے میں ریاست کی غیر جانب داری۔"

(Selected Works of Maulana Abul Kalam Azad,
Edited by Dr. Ravindra Kumar,
Vol.2, New Delhi (India) 1991, P.123)

اس غیر فرقہ واری جمہوری غیر مذہبی دستور نے فیصلہ کر دیا کہ مسلمان اور دوسری اقلیتیں ہندوستان میں پابند اور مجبور اقلیتیں نہیں۔ وہ اس ملک میں برابر کی شہری ہیں اور خواہ ان کی تعداد اس ملک میں کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو، وہ اس ملک کی

اسی طرح مالک ہیں، جس طرح ملک کی کوئی دوسری قوم اور اکثریت مالک ہو سکتی ہے ملک کی قسمت کا کوئی فیصلہ ان کی رائے کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان کی عظمت کا ہیکل ان کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اب ان کی آزادی اور ہمہ قسم کے حقوق کسی حکومت کے بخشے ہوئے نہیں یا کسی قابض واستبداد کی ان کے لیے رعایت نہیں، بلکہ ان کا قانونی حق ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو کاغذوں میں لکھ دی گئی ہو اور دستورِ ہند نامی دستاویز کی زینت بنادی گئی ہو لیکن عملی دنیا میں اس کا اعتراف نہ کیا گیا ہو۔ اس کے مثبت نتائج بھی سامنے آئے، چنانچہ ایک اخباری اطلاع کے مطابق:

> " ۱۲ - مئی ۱۹۵۰ء کو پٹیالہ یونین کے ۴۵ ہزار مسلمان جنھیں ۱۹۴۷ء میں فساد کی وجہ سے ہندو بنالیا گیا تھا، وہ دوبارہ مسلمان ہوگئے اور حکومتِ ہند نے انھیں نئے سرے سے پٹیالہ یونین میں بسانے کا کام شروع کردیا۔"
>
> (روزنامہ خلافت بمبئی، ۱۴ - مئی ۱۹۵۰ء، بہ حوالہ "مولانا آزاد --- ایک سیاسی ڈائری"، ص ۴۵۳)

اس جمہوری غیرمذہبی دستور کا نتیجہ تھا کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ہندو راج کا مطالبہ کرنے والوں کو متنبہ کیا۔ خلافت بمبئی کے مطابق:

> " ۲ - اگست ۱۹۵۰ء کو دہلی میں وزیر داخلہ سردار پٹیل نے پنڈت کنزرو (H.N. KUNZRU) کے اعتراض کے جواب میں کہا کہ ملک میں شہری آزادی پر پابندی نہیں ہے۔ میں یہ ثابت کرنے کو تیار ہوں کہ ملک کا ایک طبقہ اس پر مطمئن نہیں ہے کہ اس نے گاندھی جی کو قتل کر ڈالا، بلکہ ہندو مہاسبھا کے سابق صدر مسٹر بھوپتکر کے ایک ساتھی نے مجھے مطلع کیا کہ یہ طبقہ وزیر اعظم نہرو کو بھی قتل کر ڈالنا چاہتا ہے۔ مسٹر بھوپتکر جلتے ہوئے بنگال پر تیل چھڑک کر ملک میں امن کو برباد کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہم ہندو راج اور برہمن راج کے مدعیان کو ہرگز کامیاب نہ ہونے دیں گے۔"

(روزنامہ خلافت، بمبئی - ۱۴- اگست ۱۹۵۰ء، بہ حوالہ "مولانا آزاد ---
ایک سیاسی ڈائری"، ص ۴۵۸)

پرشوتم داس ٹنڈن صدر کانگریس نے ۲۰- ستمبر ۱۹۵۰ء کو ناسک میں کانگریس کے ستاونویں سالانہ اجلاس کے خطبہ صدارت میں کہا:

ہم پاکستان کے قیام کو تو نہ روک سکے، لیکن ہندوستان میں ہماری پالیسی ہندو، مسلمان، سکھ، بدھی، جین، پارسی اور عیسائی میں امتیاز نہیں کرتی ...... ہمارے دستور کے تحت ہماری حکومت غیر مذہبی ہے - اس میں ہر شہری کو مساوی حقوق حاصل ہیں - یہ ہمارے ملک کی شرافت اور دور اندیشی کا ثبوت ہے -" (مولانا آزاد --- ایک سیاسی ڈائری، ص ۴۶۳)

۱۱- اکتوبر کو صدر کانگریس بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے دہلی سے شائع ہونے والی ایک اپیل میں ہندوستان کی غیر مذہبی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"ہندوستان میں کسی مذہبی کتاب پر کوئی حکومت قائم نہیں کی جاسکتی کیوں کہ یہاں بہت سی مذہبی کتابیں موجود ہیں - لہذا مذہبی حکومت کے قیام کا مطالبہ ہندوؤں کی آپس میں خانہ جنگی کا باعث ہو جائے گا - اس لیے کہ وہ خود مختلف کتابوں کے پیرو کار ہیں - چناں چہ یہاں تمام مذہبی فرقوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے -"

یہاں ہم نے سردار پٹیل اور بابو ٹنڈن کے بیانات کو پیش کیا اس لیے کہ انھیں مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں غیر سنجیدہ کہا جاتا ہے - شاید ایسا ہی ہو، لیکن ہندوستان کے بارے میں ان کے اخلاص پر شبہ نہیں کیا جاسکتا - ان بیانات میں انھوں نے صاف لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ ہندوستان کے لیے غیر فرقہ وارانہ غیر مذہبی دستور ہی مناسب تھا - اس کے سوا کسی خاص مذہبی کتاب اور فلسفے کی بنیاد پر کوئی نظام بنایا اور چلایا نہیں جاسکتا -

---

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس جمہوری دستور کی تیاری میں مشکلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"بہرحال کانگریس اور مسلم لیگ میں فرقہ وارانہ مسائل پر سمجھوتا نہ ہو سکا اور انجام کار دو قومی نظریہ پیدا ہوا اور اس کی بنیاد ہی پر ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور اسی کی بنیاد پر پاکستان کو اسلامی حکومت قرار دیا گیا۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد ہندو مسلمانوں میں جو نہایت شدید قسم کی منافرت، دشمنی اور عداوت پائی جاتی تھی وہ، اور پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام، یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں جن کے پیش نظر اغلب یہی تھا کہ ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہوتی! لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ یہاں پارلیمنٹری نظام جمہوریت اختیار کیا گیا۔

اس نظام کے ماتحت ہر شخص جو ہندوستانی ہے، مذہب، ذات پات، رنگ و نسل کے اختلاف کے باوجود یکساں شہری حقوق رکھتا ہے، پیشوں میں ملازمتوں میں، عہدوں میں غرض کسی ایسی چیز میں جس کا تعلق اسٹیٹ سے ہے مذکورہ بالا چیزوں میں سے کسی کی بنیاد پر کوئی کسی قسم کا امتیازی برتاؤ نہیں کیا جائے گا، ہر شخص جو بالغ ہے اس کو رائے دینے کا حق ہو گا۔ شہری حقوق اس ملک کے ہر باشندے کو یکساں طور پر حاصل ہوں گے۔ حق رائے دہندگی (Adult Franchise) کے ذریعے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کا انتخاب ہو گا اور یہی پارلیمنٹ اور اسمبلیاں گورنمنٹ بنائیں گی۔ اس طرح جو گورنمنٹ بنے گی اس کی تشکیل میں تمام اہالیان ملک کا دخل ہو گا۔ گویا اصل طاقت بلا اختلاف مذہب و ملت عوام کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہیں حکومت کے منصب پر بٹھا سکتے ہیں اور جب چاہیں اسے الگ بھی کر سکتے ہیں۔

اب لیجیے مذہبی آزادی! اس سلسلے میں دستور اعلان کرتا ہے کہ:

۱ .... ہندوستان کے سب لوگوں کو مساویانہ طور پر عقیدہ (Conscience) کی آزادی کا حق ہو گا اور ان کو اس بات کا بھی حق ہو گا کہ وہ آزادی کے ساتھ جس مذہب کو چاہیں مانیں، اس پر عمل کریں اور اس

کی تبلیغ کریں۔

۲ .... ہر مذہبی فرقے یا طبقے کو اس کا حق ہو گا کہ وہ مذہبی اور خیراتی کاموں کی خاطر؛

الف: ادارے قائم کریں اور چلائیں۔

ب: مذہبی معاملات میں اس کا وہ خود انتظام کریں۔

ج: اس ادارے کے لیے منقولہ یا غیر منقولہ جائداد حاصل کریں۔

د: اور اس جائداد کا انتظام قانون کے مطابق وہ خود کریں۔

(The Constitution of India,
Part. III, Article 25, 26.)

جب یہ دفعات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوئیں تو اقلیتی فرقوں کے نمایندوں کی طرف سے ان کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ ایک صاحب نے فرمایا:

"جناب! یہ ہے اکثریت کا وہ عادلانہ اور مساویانہ برتاؤ جو اقلیتوں کو ان کے ساتھ دو قالب و یک جان بنا دے گا۔"

ایک اور صاحب نے کہا:

"میں اکثریتی فرقے کا تہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اقلیتی فرقوں کے ساتھ بڑے عدل اور انصاف سے کام لیا ہے۔"

(Constitutional assembly debates,
Vol. VII, pp.260-67.)

دستور نے صرف یہی اعلان نہیں کیا ہے کہ ہر شخص کو مذہبی عقائد و اعمال اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی ہوگی، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ "حکومت مذہب کے معاملے میں بالکل غیر جانبدار ہوگی اور اس بنا پر حکومت کے فنڈ سے جو تعلیمی ادارے چلیں گے، ان میں کسی مذہب کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہوگا۔"

(The constitution of India,

Part III, Article 28.)

(برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت، ص ۴۸-۴۹)

دستورِ ہند کی اس غیر فرقہ واری جمہوری اور سیکولر حیثیت کا اعتراف شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے بھی فرمایا۔ لیکن حضرت نے مسلمانوں کو متنبہ بھی فرما دیا کہ مسلمانوں کو اپنے بہت سے مذہبی، تہذیبی اور معاشرتی کام خود ہی انجام دینا ہوں گے اس کے لیے ہمیں سیکولر اسٹیٹ سے کسی قسم کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاس حیدرآباد دکن (اپریل ۱۹۵۱ء) میں اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا:

"ان تباہیوں اور بے پناہ مشکلات کے باوجود جو تقسیم ہند کے بعد برداشت کرنی پڑی ہیں، یہ بات قابل اطمینان ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا اقتدارِ اعلیٰ (High Command) اپنے نظریات کے محور سے نہیں ہٹا گاندھی جی کی قربانی ایک کھلی حقیقت ہے۔ پنڈت نہرو، مولانا آزاد، راج گوپال اچاریہ جیسے گاندھی جی کے ساتھیوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ انڈین یونین کا دستورِ اساسی (Constitution) جمہوریت اور غیر فرقہ واریت کے اصول پر وضع کیا گیا۔

یہ بات قابل مسرت ہے کہ یہ "دستور" ہندوستان کے ہر ایک باشندے کو مساوی حیثیت دیتا ہے، بلا اختلاف مذہب و ملت ہر ایک کے لیے ترقی کے دروازے کھلے رکھتا ہے اور ہر ایک ملت کو موقع دیتا ہے کہ وہ بقا و تحفظ اور ترقی کے راستے سوچے اور آزادی کے ساتھ ان پر عمل کرے۔ اس لیے اس دستور کے بموجب ذمہ داری خود ہمارے اوپر آتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ پوری مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ ہم اس کو انجام دیں۔

جمہوری دستور ساری ذمہ داری جمہور پر ڈالتا ہے، جمہوریہ کی حفاظت اور ترقی جمہور کا فرض ہے۔ جمہور کی اصلاح جمہوریت کی درستی ہے۔

جمہور کی شائستگی، سرگرمی اور ایثار سے جمہوریہ ترقی کرتا ہے۔ آج مسلمانوں پر جمہوریہ ہند کا اہم عنصر ہونے کے لحاظ سے کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس کو وہ کس طرح انجام دے سکتے ہیں، کہاں تک اس ذمہ داری کو انجام دے چکے ہیں اور آئندہ انھیں کیا جدوجہد کرنی ہے؟ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان تمام باتوں پر غور کریں اور جسدِ ملک کا ایک بازو ہونے کی حیثیت سے ہمارے ملی اور اجتماعی فرائض کیا ہیں، ہم کس طرح اپنے مذہب، مذہبی علوم، اسلامی تہذیب، اپنے مآثر و معابد اور اپنے اوقاف کی حفاظت کر سکتے ہیں اور ان کو ترقی کے راستہ پر کس طرح لگا سکتے ہیں، کیا کیا مشکلات سنگِ راہ ہیں اور ان کو رفع کرنے کی کیا صورتیں ہیں؟ غرض کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی حفاظت و ترقی کے ساتھ ساتھ ملک کی "تعمیر جدید" میں اپنی حیثیت اور تاریخی عظمت کے مطابق ان کا حل تلاش کرنا جمعیت علمائے ہند کا فرض ہے"۔

(خطباتِ صدارت، ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم۔ گوجرانوالہ، ۱۹۹۰ء، ص ۲۶-۴۲۵)

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ سورت کے خطبہ صدارت میں بھی ہندوستان کے سیکولر دستور اور مسلمانوں کے فرائض کے سلسلے میں حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا:

ہماری ماضی بعید تاریخ کا سب سے روشن باب ہے۔ ماضی قریب دورِ غلامی اور اب نو سال سے آزاد مملکت میں نوزائیدہ جمہوریہ کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ہم اس آزاد مملکت میں باعزت شہری بن کر رہیں یا پس ماندہ اور از پا افتادہ، خود فراموش و معاذ اللہ خدا فراموش بن کر زندگی گزاریں، یہ ہمارے فکرِ صحیح، فراست، بیدار مغزی اور ہمارے عمل اور کردار پر موقوف ہے۔ کوئی بھی صحیح الحواس پس ماندگی کو پسند نہیں کر سکتا۔ ہر ایک سلیم الفطرت پس ماندگی کی ذلت و خواری کو موت سے بدتر سمجھتا ہے۔

مگر عزیزانِ محترم! جب تک سعی پیہم اور جدوجہد کی روشنی نمایاں نہ

ہو ۔ پس ماندگی کی تاریکی کو چھانٹا نہیں جاسکتا ۔

پس ماندگی ظلمت و تاریکی ہے اور جدوجہد نور اور روشنی ۔ جب بھی کوشش اور سعی پیہم کی روشنی دھیمی پڑتی ہے، پس ماندگی کی تاریکی ابھر آتی ہے آپ اگر پس ماندگی کی تاریکی ختم کرنا چاہتے ہیں تو صراط مستقیم پر جدوجہد کی روشنی تیز کر دیجیے ۔ دنیا کا کام ہو یا دین کا، جماعتی ہو یا انفرادی ۔ ہر ایک کے لیے قانون قدرت یہی ہے ۔

لیس للانسان الا ماسعی " انسان کو وہی ملتا ہے جو اپنی کوشش سے حاصل کرے ۔ اللہ رب العالمین کا فضل و احسان اور اس کی بخشش ہے کہ اس نے انسان کو احسن تقویم کا پیکرِ زیبا عطا فرما کر خلعتِ خلافت سے نوازا ۔ بر و بحر پر اس کے اقتدار اور اس کی عظمت کا جھنڈا ابرا کر ولقد کرمنا کی سند عطا فرمائی ۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ عمل صالح اور عمدہ کردار سے اس جھنڈے کو سربلند رکھتا ہے یا اپنی بے عملی سے اس کو سرنگوں کر ڈالتا ہے ۔

عزیزان محترم! ہندوستان جیسے مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبوں کے گہوارے میں جمہوری نظام حکومت کے لیے دو ہی اصول ہو سکتے تھے ۔ سب مذہبی یا لامذہبی ؟

ہندوستان کے لیے دوسرا اصول یعنی لامذہبی جمہوریہ ہی طے کیا گیا ہے یعنی ایسا جمہوریہ کہ نہ اس کی دستور ساز و قانون ساز مجالس میں مذہب کے نام پر نمائندگی ہو اور نہ نظام حکومت کسی مذہب یا فرقہ کا جانبدار ہو ۔ تمام فرقے اس کی نظر میں صحیح معنی میں یکساں ہوں ۔ کیونکہ یہی ایک صورت ہے جس سے اقلیت اور اکثریت کے نفرت انگیز احساس کو ختم کیا جاسکتا ہے اور یہی ایک صورت ہے جو اقلیتوں کے دماغ سے احساس کمتری دور کر کے ان کو اپنی قابلیتوں کے جوہر دکھانے پر آمادہ اور ان کے افراد کو روشن مستقبل کی توقع دلا کر ترقی کے راستے پر تیز گام کر سکتی ہے ۔

لیکن اس صورت میں کسی بھی ملت اور فرقہ کو اپنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت اور ترقی کے لیے سیکولر جمہوریہ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا اور اپنی

جدوجہد کو اس کی امداد پر موقوف رکھنا، سیکولر جمہوریہ کے بنیادی تصورات سے انحراف ہے اور ایسا غلط اعتماد اور ایسی بے محل توقع ہے کہ اس کے لیے "خوابِ پریشاں" یا "نقش بر آب" کا لفظ ہی موزوں ہو سکتا ہے۔

بہرحال سیکولر جمہوریہ کو سیاسی لحاظ سے آپ کتنا ہی قابلِ اطمینان اور باعثِ مسرت محسوس کریں، مگر یہ اطمینان کبھی بھی نہ ہونا چاہیے کہ وہ آپ کے علوم، آپ کے مذہب اور آپ کی روایات کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اپنے علوم، اپنی تہذیب اور اپنے کلچر کی حفاظت خود ہمارا اپنا فرض ہے اور اس فرض کو صرف ہمیں ہی انجام دینا ہے۔ سیکولر جمہوریہ کا امانت دار فریضہ صرف یہ ہے کہ وہ ہماری کوشش میں رکاوٹ نہ ڈالے اور ہو سکے تو مناسب حالات میں ترقی کے مواقع پیدا کرتا رہے۔ سعی پیہم بہرحال اہلِ ملت کا فرض ہے۔ اگر مثال پیش کرنے کی اجازت ہو تو میں سیکولر جمہوریہ کو ایک زرخیز زمین سے تشبیہ دوں گا۔ اس کی خوبی صرف یہ ہے کہ تخمِ عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتی۔ تخم پاشی اور آبیاری بہرحال کاشتکار کا فرض ہے۔ ملوکیت میں وہ عمل بارآور ہوتا ہے جو خوشنودی شاہ کے لیے ہو۔ جمہوریت میں وفاداری کی یہ جنس ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں وہی عمل بارآور ہوتا ہے جو جمہور اور جمہور کے وطنِ عزیز کے لیے ہو۔" (خطباتِ صدارت، ص ۶۶ - ۴۶۴)

ہندوستان کا دستور وہاں کے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں پر مسلط نہیں کر دیا گیا تھا۔ وہ اس کے بنانے میں شریک رہے تھے۔ وہ کوئی آسمانی صحیفہ نہیں کہ اس میں کوئی غلطی اور خامی نہ ہو اور ایسا بھی نہیں کہ اب اس کی کسی خامی کی اصلاح نہ ہو سکتی ہو، بلکہ اسی دستور کے مطابق ملک کے عوام کا یہ حق محفوظ ہے کہ جن ہاتھوں نے اسے بنایا ہے۔ وہ ہاتھ اس میں ترمیم و اصلاح بھی کر سکتے ہیں۔ ملک و قوم کے مشترک مقاصد کے حصول میں یہ دستور ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام دے گا۔

کسی دستور کی موجودگی کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں ہوتا کہ سوسائٹی برائیوں اور

ناانصافیوں سے پاک ہو گئی ہے ۔ سوسائٹی میں برائیاں ضرور ہوتی ہیں لیکن ایک اچھا دستور برائیوں کے انسداد میں معاون ہوتا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سماجی برائیوں نے ہندوستان کی اقلیتوں اور مسلمانوں کو بہت بے چین کر دیا ہے ، بلکہ کہنا چاہیے کہ مذہبی تعصبات اور فرقہ پرستی ، جس کے انسداد کا دستور ہند میں خاص خیال رکھا گیا تھا ، اکثریت کے ہاتھ میں ایک مہلک ہتھیار بن گئی ہے ، اس کی ہلاکت خیزیوں کی داستان بہت طویل ہے ۔ اقلیتیں اس کی ضربات شدیدہ سے چیخ اٹھی ہیں ۔ بعض عدالتی فیصلوں کو مسلمانوں نے اپنے مذہبی حقوق اور پرسنل لا میں مداخلت قرار دیا ہے ۔ بابری مسجد کے انہدام کا سانحہ بنیادی مذہبی حقوق اور ان تحفظات کے خلاف اور ہندوستان کے سیکولر کیریکٹر پر ایک نہایت بدنما دھبا ہے ، جس سے مسلمانوں کے دل زخمی ہوئے ۔ سیکڑوں ناانصافیوں کی مثالیں عوام کی زبانوں پر ہیں ۔

یہ ضمانت بھی نہیں دی جا سکتی کہ آئندہ اس قسم کے واقعات پیش نہ آئیں گے ، لیکن ہندوستان کے اسی دستور نے بنیادی حقوق کے غصب کے خلاف آواز بلند کرنے ، سماجی ناانصافیوں کو چیلنج کرنے اور ظلم کے خلاف کبھی سر نہ جھکانے کا حق دیا ہے ۔ ہندوستان کے سیکولر دستور کے تحت ظلم اور ناانصافیوں کی مثال پاکستان کے حالات کے آئینے میں دیکھ کر ہم ایک متوازن اور منصفانہ فیصلہ کر سکتے ہیں ۔ پاکستان کے دستور میں مختلف صوبوں کے حقوق متعین ہیں ۔ لیکن صوبوں کے عوام اور رہنما مرکز کے قبضہ و تسلط اور ناانصافی کے خلاف چیخ رہے ہیں ۔ دستور میں قتل ، غارت گری ، لوٹ مار ، دہشت گردی ، چوری ، ڈاکہ ، ناانصافی ، طبقاتی استحصال کے خلاف اسلامی تعلیمات اور دستوری دفعات ، تمام طبقات و افراد کے لیے ترقی کے یکساں مواقع کی ضمانت ، جرائم کی سزائیں موجود ہیں لیکن سوسائٹی میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی دستور اجازت نہیں دیتا ۔ اور جو دستور کا منشا و مقصود ہے ، وہ سوسائٹی میں نظر نہیں آتا ۔ معاشرتی ناانصافیاں اور طبقاتی استحصال عروج پر ہیں ، کمزور طبقات پر مظالم انتہا

کو پہنچ چکے ہیں ، عوام بلبلا رہے ہیں اور انسانیت کراہ اٹھی ہے ۔ لیکن ان تمام نانصافیوں ، مظالم اور استحصال کے لیے ہم پاکستان کے دستور اور اسلامی تعلیمات پر مبنی اس کی دفعات کو الزام نہیں دے سکتے ۔

ہندوستان کا سیکولر دستور مسلمانوں کے حقوق اور ان کے پرسنل لا میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا ۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ دستور ساز اسمبلی میں مسلمانوں کی دو تہائی اکثریت کسی ایسی قانون سازی کے خلاف متحد اور ایک آواز ہو لیکن اگر مسلمانوں کے نمائندے اور ان کی دو تہائی اکثریت ہی اپنے حقوق اور پرسنل لا میں مداخلت کا راستہ کھول دے تو اس کا شکوہ کس سے کیا جائے گا ۔ اس کا ثبوت ماضی بعید میں سول میرج ، شاردا ایکٹ کے پاس کرانے اور شریعت بل ، قاضی بل وغیرہ کی مخالفت میں محمد علی جناح اور سر محمد یامین خان اور لیجس لیٹو کونسل میں لیگی نمائندوں کے رویوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہے ۔ خود پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں ۔ درجنوں ایسے قوانین کی نشان دہی کی گئی ہے جس کا نہ صرف اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ بعض قرآنی اور اسلامی تعلیمات کے صریح خلاف ہیں ۔ لیکن یہ سب مسلمانوں کے بنوائے ہوئے ہیں ۔ حالیہ مثالوں میں نفاذ شریعت بل اس کی بہت بڑی مثال ہے ۔ محمد نواز شریف کے دورِ حکومت میں پارلیمنٹ نے شہریوں کے نام پر جو بل پاس کیا تھا ، وہ شریعت کے نام پر ایک فراڈ تھا ۔ یہ فراڈ ایک مسلمان حکومت نے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا ۔ اس بل کو پاس کرانے والی ایک جماعت کے رہنما نے اسے نفاذِ شریعت بل کے بجائے انسدادِ شریعت بل قرار دیا تھا ۔ اگر مستقبل میں پاکستان یا ہندوستان کی دستوری ساز اسمبلی میں مسلمانوں کے ایسے ہی نمائندے پہنچ جائیں تو شریعت حقہ اور اس کے ناموس کو ان کی آزاد خیالیوں اور تجدد پسندیوں کے نتائج فاسدہ سے کیوں کر بچایا جا سکتا ہے!

مذہبی نقطہء نظر سے کسی دستور کے بارے میں دو ہی باتیں کہی جا سکتی ہیں ؛ یہ کہ دستور اسلامی ہے یا نہیں ؟ لیکن کسی دستور کے اسلامی نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ خلافِ اسلام بھی ہے! اگر کسی ملک کے عوام اپنے سیاسی، معاشی، ملکی، شہری ترقیاتی، دفاعی مقاصد کے حصول اور تحفظ کے لیے کوئی دستور بنالیتے ہیں، تو یہ بات خلافِ اسلام نہیں۔ خالص دنیاوی مفادات کے حصول کے لیے بھی کسی ایسے معاہدہ میں شرکت اسلامی تعلیمات اور قانون شریعت سے متصادم نہیں۔ پھر ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اکثریت میں نہ ہوں، عددی اعتبار سے وہ اقلیت ہی شمار ہوں، اگر وہ اس ملک کی اکثریت اور دیگر اقلیتوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا دستور بنالیتے ہیں جس کے تحت اکثریت اور اقلیت کی عددیت سے قطع نظر، یکساں حیثیت میں تمام مذاہب کے احترام اور کسی مذہب میں خواہ اکثریت میں ہو، خواہ اقلیت میں عدم مداخلت کا اصول طے کرلیتے ہیں، جس میں مذہبی عقائد، عبادات، مساجد، مدارس، اوقاف، تعلیم و تربیت کے نظام، تحریر و تقریر اور حصول معاش کے لیے پیشے کی آزادی اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع کی ضمانت موجود ہو۔ جس میں مذہبی، غیر مذہبی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، اصلاحی، تبلیغی جماعت بنانے، ملک میں آزادانہ گھومنے پھرنے، عوام کو اپنا ہم خیال بنانے کی سعی کرنے اور ملک کے کسی حصے میں بھی آباد ہو جانے، جائیداد بنانے، کاروبار کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہو، جس میں ذات پات کی اونچ نیچ اور نسل و خون کی کسی برتری کی نفی کی گئی ہو، وہ دستور غیر اسلامی کیوں کر ہو سکتا ہے ؟ سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ جس دستور کے تحت مذہبی تبلیغ کی آزادی نے مسلمانوں کے لیے اسلامی خدمات کا ایک وسیع میدان عمل مہیا کر کے اسلامی انقلاب کے وسیع امکانات پیدا کر دیے ہوں، جس دستور کی بنیاد مندرجہ ذیل انسانی اصولوں اور عالمی سچائیوں پر ہو ہم اس کے خلافِ اسلام ہونے کا فیصلہ کیوں کر دے سکتے ہیں:

> کانگریس نے ہندوستان کے ہر شہری مرد اور عورت کے لیے مساوی
> حقوق اور مواقع کی حمایت کی ہے۔ اس نے تمام گروہوں اور مذہبی گروپوں
> کے درمیان رواداری اور خیر سگالی کے جذبات پیدا کر کے اتحاد قائم کرنے کی

کوشش کی ہے ۔ اس نے بہ حیثیتِ مجموعی تمام عوام کے لیے مکمل مواقع کی حمایت کی ہے، تاکہ وہ اپنی خواہشات اور صلاحیتوں کے مطابق ترقی کر سکیں ۔ اس نے اس بات کی بھی حمایت کی ہے کہ ایک قوم کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر گروپ اور علاقے کو آزادی ملے تاکہ وہ اپنی زندگی اور اپنے کلچر کو ترقی دے سکے ۔ اسی لیے یہ کہا گیا کہ اس مقصد کے لیے علاقوں یا صوبوں کی جہاں تک ممکن ہو لسانی اور کلچرل بنیادوں پر تشکیل نو ہو ۔ اس نے ان لوگوں کی حمایت کی، جن پر سماجی ظلم ہوا، جن کے ساتھ ناانصافی ہوئی تاکہ مساوات میں حائل تمام رکاوٹوں کا خاتمہ ہو ۔

کانگریس نے ایک جمہوری ریاست قائم کی، جس میں تمام شہریوں کے لیے مساوی بنیادی حقوق اور آزادیوں کی دستور کے ذریعے ضمانت دی گئی ہے ۔ یہ دستور دفاعی نوعیت کا ہے جس کے قائم کرنے والی وحدتوں کو خود اختیاری دی گئی ہے اور اس کے قانون ساز اداروں کا قیام بالغ رائے دہی کے اصول پر ہوتا ہے، وفاق ہند اس کے اجزا کی خواہش کی مطابق ہے ۔ وفاقی اکائیوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کی خاطر ضروری ہے کہ وفاقی سبجیکٹس کی فہرست کم سے کم ہو ۔ مزید یہ کہ اکائیوں کی خواہش کے مطابق مشترک فہرست بھی بنائی جائے ۔

دستور ملک کے عوام کو جو بنیادی حقوق دے گا، وہ یہ ہیں؛

۱۔ ہر شہری کو رائے کے اظہار، جماعت بنانے، پرامن طریقے سے بغیر اسلحہ کسی بھی مقصد کے لیے اجتماع کرنے کی، جو قانون کے خلاف نہ ہو، آزادی ہوگی ۔

۲۔ ہر شہری کو ضمیر کی آزادی ہوگی اور اختیار ہوگا کہ وہ کسی بھی مذہب پر قائم رہے، لیکن اس سے امن عامہ اور اخلاقی اقدار متاثر نہ ہوں ۔

۳۔ اقلیتوں کے کلچر، زبان اور رسم الخط کا تحفظ کیا جائے گا ۔

۴۔ تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہوں گے اور مذہب، فرقے، یا جنس کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا ۔

۵۔ سرکاری ملازمتوں میں مذہب، فرقے یا جنس کی بنیاد پر کسی قسم کا

امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

۶۔ عام مقامات پر واقع تمام کنوؤں، تالابوں، سڑکوں، اسکولوں کو جن کی دیکھ بھال ریاستی یا لوکل فنڈ سے ہوتی ہو یا جنھیں کسی نے عام استعمال کے لیے وقف کرایا ہو، ہر شہری کو استعمال کرنے کا مساوی اختیار ہو گا۔

۷۔ ہر شہری کو اسلحہ رکھنے اور ساتھ لے جانے کا اختیار ہو گا، جو اس سلسلے میں بنائے گئے قوانین اور تحفظات کا پابند ہو گا۔

۸۔ کسی شخص کو اس کی آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا، نہ اس کی ملک اور جائیداد کو ہتھیایا جائے گا یا اسے ضبط کیا جائے گا، سوائے اس کے کہ ایسا قانون کے تحت ہو۔

۹۔ تمام مذہب کے معاملے میں ریاست غیر جانب دار رہے گی۔

۱۰۔ رائے دہی کا حق دنیا کے عام معیارِ بلوغیت کے مطابق ہو گا۔

۱۱۔ ریاست مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے گی۔

۱۲۔ ہر شہری اس کے لیے آزاد ہو گا کہ وہ ہندوستان بھر میں جہاں چاہے آئے جائے یا سکونت اختیار کرے، کوئی بھی پیشہ اختیار کرے۔ وہ قانونی چارہ جوئی یا تحفظ کے معاملے میں ہند کے تمام علاقوں میں مساوی حیثیت رکھے گا۔

ریاست پست اقوام اور مظلوم افراد کی حفاظت اور ان کی ترقی کے لیے ضروری تحفظات فراہم کرے گی، تاکہ وہ تیزی سے ترقی کر سکیں اور قومی زندگی میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔ خصوصیت سے ریاست قبائلی علاقوں کے عوام کی نسلی تقاضوں کی مناسبت سے اور اچھوتوں کے طبقے کی تعلیم، سوشل اور معاشی ترقی کی کوشش کرے گی۔"

(Selected Works of Maulana Abul Kalam Azad, Edited by Dr. Ravindra Kumar, Vol.2, New Dehli (India), 1991, PP.121-23)

یہ کانگریس پارٹی کا وہ منشور ہے جو اس نے ۱۹۴۵ء میں انتخابات کے موقع پر شائع کیا تھا۔ حالاں کہ یہ وہ انتخابات تھے جنھیں ہندوستان میں کفرو اسلام کا معرکہ قرار دیا گیا تھا۔ کانگریس نے اس وقت بھی اپنے فکری نظریاتی نظام میں توازن برقرار رکھا تھا تو یہ بہت بڑی بات تھی۔ کانگریس کے انتخابی منشور کے یہ اصول و مقاصد آزاد ہندوستان کے دستور میں اختیار کر لیے گئے ہیں۔

ہندوستان کا دستور انسانوں کا بنایا ہوا دستور ہے۔ اس کی بنیاد کسی آسمانی کتاب پر نہیں ہے۔ اس لیے یہ خامیوں اور نقائص سے بالکل پاک نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر اس میں ترمیم و اصلاح کا دروازہ کھلا ہے تو اس کے خوب سے خوب تر بن جانے سے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کی توجہ اور ان کے مساعی نے اسلام کا نام لیے بغیر ہندوستانی دستور میں بہت سے ایسے اصول و مقاصد کو شامل کروا دیا ہے، جن کی روح اور فکری پس منظر اسلام کے نظام عدل اور انسانیت کے بنیادی حقوق و مفادات پر مبنی ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمان بصیرت اور حکمت سے کام لیں تو دستور ہند کی خامیاں اور نقائص دور کروا کے معاشرتی صلاح و فلاح کی بے شمار باتیں جن کا تعلق اسلامی تعلیمات سے ہے، اس میں شامل کروا سکتے ہیں۔

پاکستان میں دستور سازی کی داستان بڑی الم ناک ہے۔ ۱۹۵۸ء تک ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کی بنیاد پر آرڈی نینسوں کے ذریعے حکومت چلائی گئی۔ ۱۹۵۶ء میں پہلا جمہوری دستور بن گیا تھا اور اس کے تحت ۱۹۵۸ء میں پہلے انتخابات ہونے والے تھے کہ ایوب خان نے ملک پر مارشل لا مسلط کر دیا اور دستور منسوخ کر دیا۔ ایوب خان نے نہ صرف دستور منسوخ کیا بلکہ ملک کو بنیادی جمہوریت (Basic Democracy) کے ایک نئے نظام حکومت سے متعارف کرایا۔ ملک کی آئندہ تاریخ کے ۱۱ برس اس تجربے کی نذر کر دیے۔ ایوب خان کی جگہ یحییٰ خان نے سنبھالی تو انھوں نے بیسک ڈیموکریسی کے نظام کی بساط کو تہ کر دیا اور حکومت چلانے کے لیے ایک عارضی لائحہ،

عمل (Frame Work of Order) نافذ کیا۔ ۱۹۷۰ء میں الیکشن ہوئے لیکن اکثریت سے جیتنے والی پارٹی کو اقتدار منتقل نہیں کیا گیا اور اس کے نتیجے میں پاکستان کا ایک بازو اس سے الگ ہو گیا۔ ۱۹۷۲ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کی زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لی ۔ ۱۹۷۳ء میں ملک کو ایک نیا متفقہ جمہوری اسلامی آئین ملا ، لیکن ۱۹۷۷ء کے آئین کے تحت پہلے انتخابات کے فوراً بعد ملک ایک شدید آئینی بحران میں مبتلا ہو گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے ملک کے تمام سیاسی رہنماؤں کو جیلوں میں ڈال دیا اور اقتدار پر خود قابض ہو گئے ۔ انھوں نے دستور کو منسوخ نہیں کیا ، لیکن ترمیمات کر کر کے اس کی ایسی شکل بگاڑ دی کہ وہ کسی آزاد جمہوری ملک کا دستور معلوم ہی نہ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ قوت واختیار ایک شخصیت میں مرتکز ہو کر رہ گیا۔ اب ملک ایک بار پھر تجربات اور آئینی بحران کی زد میں تھا، شورائی نظام کا تجربہ ، مجلس شوریٰ کا قیام ، غیر جماعتی انتخابات اور حکومت کا قیام اور اس کی برخواستگی ، اسلامی نظام کیا ہے ، وہ صدارتی ہے ، آمرانہ ہے یا اس سے قریب پارلیمانی ہے یا غیر پارلیمانی یا اس سے دور اسلام کے نام پر ریفرنڈم کے ذریعے ایک شخصیت پر اعتماد اور تمام اختیارات کا ایک ہی آمرانہ شخصیت میں ارتکاز، حدود و تعزیرات آرڈی نینسوں کا اجرا۔ اس دور کی پروردہ بعض اسلامی جماعتوں کی دھما چوکڑی نے وہ حالات پیدا کیے کہ عوام کا اسلام پر ایمان متزلزل اور اسلامی نظام پر ان کا اعتقاد مجروح ہو گیا۔ ۱۹۸۸ء میں ایک آمرانہ شخصیت کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد بھی اس کے گیارہ سالہ دور کی تربیت یافتہ نوکر شاہی اور مراعات یافتہ طبقے نے ۱۹۸۸ء کے انتخابات کے نتیجے میں ابھرنے والی نئی سیاسی جمہوری قوت کو پنپنے نہ دیا اور ۱۹۹۱ء کے وسط تک پہنچتے پہنچتے اسے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اس دوران میں سیاست میں کئی نشیب وفراز آئے ، کئی حکومتیں بنیں اور ٹوٹیں ۔ یہ سب کچھ ۱۹۸۸ء تک کے حالات کے تسلسل ہی میں تھا۔

ان حالات کے لیے طالع آزما آمروں، مفاد پرست سیاست دانوں اور برٹش عہد کے بیوروکریٹوں اور ان کی تربیت یافتہ نوکر شاہی کو خواہ کتنا ہی ذمہ دار ٹھہرایا جائے اور خواہ دستور سازی کی تاریخ کچھ ہی کیوں نہ رہی ہو اور خواہ انھوں نے اس میں اسلامی نظام نافذ نہ کیا ہو۔ اس بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ یہ ملک مسلمانوں کا ہے اس میں قوت واقتدار کے مالک مسلمان ہیں، انھیں قانون سازی کا کلی اختیار حاصل ہے۔ اگر وہ عوام کے مطالبے کے مطابق قانون سازی نہ کریں تو عوام ان سے بازپرس کر سکتے ہیں، لیکن ملک کی اسلامی وقانونی حیثیت ان کی بے عملی سے متاثر نہیں ہو سکتی مسلمان خواہ بے عمل اور خواہ حکمراں فسق وفجور میں مبتلا ہوں، لیکن وہ پاکستان میں اقتدار واختیار کے مالک ہیں۔ ملک کی دستوری اور قانونی حیثیت اسلامی یا دارالاسلام کی مسلمہ ہے۔ پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ کے نشیب وفراز اور اس کی الم ناکی سے اس کی بنیادی قانونی اور شرعی حیثیت متاثر نہیں ہوئی۔ اس لیے پاکستان کی تعمیر وترقی اور اس کے حفظ ودفاع کے تمام اعمال مسلمانوں کے اسلامی فرائض میں شامل ہوں گے۔ یہ بات کہ ملک کی یہ حیثیت قرار دادِ مقاصد کے بعد ہوئی، پہلے نہ تھی۔ اس لیے پہلے کسی مسلمان پر ملک سے وفاداری اور حکومت کے فیصلوں کی پابندی لازم نہ تھی، نہایت غیر معقول ہے۔

اب ہندوستان اور پاکستان دو الگ الگ آزاد ملک ہیں، دونوں کے دستور الگ ہیں، اس لیے دونوں ملکوں کے مسلمانوں کی وفاداری کا مرکز ایک نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانی مسلمان اپنے ملکی اور قومی فیصلوں کے پابند اور اپنے ملکی دستور کے وفادار ہوں گے اور اہل پاکستان اپنی حکومت کے فیصلوں کے پابند اور اپنے ملک اور دستور کے وفادار رہیں گے۔ اس کے باوجود کہ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کا مذہب ایک ہے، دونوں الگ الگ دو قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں کے ملکی، قومی اور سیاسی مقاصد ومفادات میں اختلاف وتباین ہے۔ صرف اشتراکِ مذہب کی بنیاد پر

ایک دوسرے سے ہمنوائی اور وفاداری کی توقع کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ بانی پاکستانی کے اس اصول کا بھی کوئی اخلاقی اور قانونی جواز نہیں کہ ہندوستان کے صوبوں کی مسلمان اقلیت کے مفاد کو مسلمان اکثریت کے صوبوں (پاکستان) کے مفاد پر قربان کر دیا جانا چاہیے۔ اگر اس اصول کی کوئی اخلاقی اور قانونی حیثیت ہو اور ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان ایک قوم ہوں تو ہندوستان کے (۱۹ تا ۲۰ کروڑ) مسلمان پاکستان کے ۹، ۱۰ کروڑ مسلمانوں سے بجا طور پر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ان سے پوچھا جائے کہ ان کا اجتماعی مفاد کیا ہے اور اس کے احترام میں پاکستان کے مسلمان اپنے مفادات و مقاصد سے دستبردار ہو جائیں۔ لیکن اس بات کا کوئی ہوش مند شخص تصور بھی نہیں کر سکتا۔

تقسیم ملک کے فیصلے (۳۔ جون ۱۹۴۷ء) کے بعد جب بانی پاکستان نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان کی حکومت کے وفادار رہیں (گفتار قائدِ اعظم۔ پروفیسر احمد سعید، ص ۱۵-۳۱۳) تو گویا انھوں نے فیصلہ کر دیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کی حکومت کی رعیت ہیں اور ان کا ہر معاملہ ہندوستان کا اندرونی مسئلہ ہے۔ یہی حیثیت پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کی تھی۔ گویا یہ بات قیام پاکستان کے وقت ہی قطعی طے شدہ تھی کہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کا مسئلہ ہندوستان کا داخلی مسئلہ ہے اور اگر کچھ ناخوش گوار حالات پیدا ہوئے تو انھیں ہندوستانی حکومت ہی حل کرے گی۔ اسی طرح پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کا مسئلہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو پاکستان خود حل کرے گا۔ کوئی ملک دوسرے ملک کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ لیاقت نہرو معاہدے نے اس کی توثیق مزید کر دی تھی۔

باب اوّل :

ہندوستان کی شرعی حیثیت

"ہندوستان اور دار الحرب" کے نام سے دار الاشاعت رحمانی مونگیر (بہار) کی طرف سے اعلیٰ کاغذ پر اور عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ بڑے سائز پر سات صفحے کا ایک رسالہ شائع ہوا ہے[1] جو حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی ایک تحریر پر مشتمل ہے۔ اس تحریر میں ہندوستان کے متعلق دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ اصل تحریر فارسی میں ہے۔ اس پر اردو میں مولانا سید منت اللہ صاحب مونگیری امیر شریعت بہار نے ڈیڑھ صفحہ کی جو تقریب لکھی ہے اُس میں انھوں نے اس کی روئداد لکھی ہے کہ یہ تحریر خانقاہ رحمانیہ تک کیوں کر پہونچی، اور پھر جزم ویقین کے ساتھ لکھا ہے کہ اس تحریر کے مصنف (صرف کاتب یا ناقل نہیں) حضرت شاہ صاحب ہی ہیں، اور اس بنا پر یہ فتویٰ شاہ صاحب کا ہی ہے، امیر شریعت بہار نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لگے ہاتوں موجودہ ہندوستان کی نسبت بھی اپنے عندیہ کا اظہار کر دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

> "ظاہر ہے حضرت شاہ صاحب کی یہ تحریر تقریباً چالیس برس پہلے کی ہے، جب کہ انگریزوں کا دورِ حکومت تھا، اس تحریر میں دار الحرب کے لیے جو اصل وبنیاد بتلائی گئی ہے اسے سامنے رکھ کر موجودہ ہندوستان کے متعلق بھی آسانی سے فیصلہ کن رائے قائم کی جاسکتی ہے۔"

اس بنا پر اس موضوع پر ہماری گفتگو کے دو جزو ہوں گے۔ پہلے جز میں گفتگو زیر بحث تحریر و رسالہ سے متعلق ہوگی، اور دوسرے جز میں موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق۔

---

[1] یہ رسالہ بہت دن ہوئے شائع ہوا تھا اور انھیں دنوں میں برہان میں تبصرہ کے لیے موصول ہوا تھا۔ لیکن میرے قیام کناڈا اور دوسرے سفر اور مصروفیتوں کے باعث کتب برائے تبصرہ کا جو عظیم انبار لگ گیا ہے یہ رسالہ بھی اسی انبار میں دبا پڑا رہا اور ابھی چند روز ہوئے تبصرہ کی کتابوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے نظر سے گزرا ہے۔

شاہ صاحب کی طرف غلط انتساب:

ہم خود حضرت الاستاذ کے خط سے آشنا ہیں۔ اور آپ کے متعدد خطوط اور تحریریں ہمارے پاس محفوظ بھی تھیں جو ۴۷ء کے ہنگامہ میں گھر کے سب سامان کے ساتھ لٹ گئیں۔ اس بناء پر اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ یہ تحریر لکھی ہوئی حضرت الاستاذ کے ہاتھ کی ہی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ حضرت الاستاذ اس کے صرف ناقل ہیں مصنف نہیں، کاتب ہیں، صاحبِ تحریر نہیں۔ اس بنا پر اس تحریر میں جو کچھ درج ہے اُس کو شاہ صاحب کی رائے یا فتویٰ قرار دینا قطعاً غلط ہے۔ چنانچہ اتنی بات تو مولانا منت اللہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ تحریر شاہ صاحب کے مسودات میں ملی ہے، اور اس پر شاہ صاحب کے دستخط نہیں ہیں۔

کیا یہ فتویٰ حضرت گنگوہی کا ہے:

اصل یہ ہے کہ اب سے کم و بیش چھیالیس برس پہلے یعنی ۱۳۵۲ھ میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچوی نے مکتبہ دار التبلیغ دیوبند ضلع سہارنپور کی طرف سے ایک رسالہ شائع کیا تھا جس کا عربی نام " فیصلة الاعلام فی دار الحرب و دار الاسلام " اور اردو نام " کیا ہندوستان دار الحرب ہے " تھا، مفتی صاحب اس رسالہ کے تعارف میں لکھتے ہیں:

> " ہندوستان کے دار الاسلام و دار الحرب ہونے کا مسئلہ ایک عرصہ سے زیرِ بحث چلا آتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آج قطبِ عالم جنید زمان ابوحنیفۂ وقت حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ فتویٰ شائع کیا جاتا ہے جو آپ نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے متعلق بعض اہلِ علم تلامذہ کے سوال کے جواب میں مفصل و مکمل تحریر فرمایا ہے اور جس کی نقل حضرت ممدوح کے صاحبزادے حکیم مسعود احمد صاحبؒ نے احقر کو عطا فرمائی تھی۔ اور حضرت کے اقارب و تلامذہ میں دوسرے متعدد حضرات کے پاس بھی اس کی نقلیں موجود ہیں۔ "

علاوہ ازیں ہمارے شعبۂ دینیات کے لکچرار قاری محمد رضوان اللہ جن کو حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ پر ایک ضخیم تحقیقی مقالہ پیش کرنے پر مسلم یونیورسٹی کی طرف سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری ملی ہے ـــــــ مفتی محمد شفیع صاحب ان کو ایک خط مورخہ ۷ ارمحرم الحرام ۸۳ھ میں تحریر فرماتے ہیں:

"میں قدیم زمانۂ طالبِ علمی سے سنتا تھا کہ حضرت گنگوہی کا کوئی فتویٰ اس سلسلہ میں مفصل ہے۔ پھر عرصہ دراز کے بعد میں گنگوہ گیا تو حضرتِ گنگوہی کے مسودات میں مجھے یہ فتویٰ ملا اور میں نے اسے حکیم مسعود احمد صاحب سے مانگ لیا جو آپ نے عنایت فرما دیا۔ میں نے اُردو ترجمہ کے ساتھ اس کو شائع کر دیا۔"

جناب مفتی صاحب نے اس فتویٰ کو اس طرح شائع کیا ہے کہ اوپر اصل متن فارسی میں ہے، اس کے نیچے خود مفتی صاحب کے قلم سے اُردو ترجمہ ہے اور ادھر اُدھر جو حواشی ہیں وہ مولانا محمد سہول صاحب عثمانی نے لکھے ہیں جو اُس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی تھے۔ اب آپ حضرت شاہ صاحب کی تحریر کو حضرت گنگوہی کی تحریر کے ساتھ ملا کر پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اول الذکر مؤخر الذکر کی حرف بحرف نقل ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اس قدر کہ فتویٰ کے ناقل چوں کہ حضرت شاہ صاحب خود ہیں اس لیے املا اور کتابت کے اغلاط سے یہ تحریر بالکل پاک وصاف ہے اور مفتی صاحب کے شائع کردہ رسالہ میں متعدد غلطیاں تصحیح سے رہ گئی ہیں۔ علاوہ بریں حضرت شاہ صاحب نے اس کو نقل کرتے وقت اصل عبارت میں جو بعض جملے مکرر یا غیر ضروری تھے ان کو حذف کر دیا ہے۔ اس معمولی فرق کے علاوہ دونوں تحریریں من وعن ایک ہیں، اس بنا پر جیسا کہ مفتی صاحب نے لکھا بھی ہے جہاں حضرت گنگوہی کے متعدد اقارب وتلامذہ کے پاس حضرت کے اس فتوی کی نقول موجود تھیں ایک نقل حضرت شاہ صاحب کے پاس بھی تھی۔ اور اس کو ہی خود حضرت شاہ صاحب کی تحریر سمجھ کر آپ کی طرف منسوب کر کے چھاپ دیا گیا ہے۔

ہندوستان کے متعلق حضرت شاہ صاحب کی رائے:

مذکورۂ بالا تفصیلات سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ زیرِ تبصرہ فتویٰ حضرت شاہ صاحب کا ہر گز نہیں ہے۔ اب رہی یہ بات کہ خود حضرت شاہ صاحب کا اس بارہ میں خیال کیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے نزدیک ہندوستان دار الحرب نہیں بلکہ دار الامان بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ فقہا کی اصطلاح میں (جس پر بحث آگے آرہی ہے) دار العہد تھا۔

چنانچہ دسمبر ۲۷ء میں پشاور کی جمعیۃ علمائے ہند کی عظیم الشان سالانہ کانفرنس میں بحیثیتِ صدر کے آپ نے جو ایک نہایت معرکۂ آرا خطبۂ صدارت فارسی زبان میں پڑھا تھا اُس میں اس کا ذکر کیا ہے، اور ہندوستان کی اُس وقت کی پوزیشن کا مقابلہ اُس وقت سے کیا ہے جب کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور یہودِ مدینہ کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ فرماتے ہیں:

"ملکِ ما اگر ہست دارِ امان ست و ما سکونت اندرانِ داریم۔ باید کہ احکام این دار از کتبِ مذہب تلاش کنیم۔ استیعاب آن این دقت ممکن نیست البتہ جملۂ چند از معاہدۂ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم با یہودِ مدینہ در ابتداء ہجرت از سیرت ابن ھشام نقل می کنم کہ نمونہ از نوعیت معاہدہ با غیر مسلم در غیر دار اسلام معلوم شود"[1]

شاہ صاحب ہندوستان کو دار العہد مانتے تھے، اسی وجہ سے پشاور کے مذکورۂ بالا اجلاس میں حکومتِ ہند سے محکمۂ قضا کے قیام کا مطالبہ کیا گیا، اور اس سلسلہ میں جو تجویز منظور ہوئی تھی اُس میں محکمہ سے متعلق یہ الفاظ بھی تھے "جو بحسب معاہدہ حکومت ہمارا شرعی حق ہے"[2]

حضرت گنگوہی کا ایک اور مطبوعہ فتویٰ:

اب آئیے اصل تحریر پر گفتگو کریں۔ جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب نے جزم ویقین کے ساتھ بیان کیا اور لکھا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ واقعی حضرت گنگوہی کی تحریر ہے تو قطع نظر اس بات کے کہ اس تحریر پر حضرت گنگوہی کے دستخط نہیں ہیں اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مسودات میں مفتی صاحب کو اسی طرح ملی تھی جس طرح مولانا منت اللہ کو شاہ صاحب کے مسودات میں دستیاب ہوئی تھی۔ ایک بڑا اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ اس تحریر میں حضرت

---

[1] مہاجر دیوبند ج ۲ نمبر ا ص ۴۔ [2] مہاجر ج ۱ نمبر ۱

گنگوہی نے پوری قوت وصراحت کے ساتھ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا ہے۔ لیکن ایک اور فتویٰ جو مطبوعہ ہے اور جس پر آپ کے دستخط اور مہر بھی ہے وہ فتویٰ اوّل کی تردید کرتا ہے چنانچہ ایک شخص نے سوال کیا "ہند دارالحرب ہے یا نہیں"؟ اس کے جواب میں فرمایا:

"ہند کے دارالحرب ہونے میں اختلاف علماء کا ہے۔ بظاہر تحقیقِ حال بندہ کی خوب نہیں ہوئی۔ حسب تحقیق اپنی کے سب نے فرمایا ہے، اور اصل مسئلہ میں کسی کو خلاف نہیں اور بندہ کو خوب تحقیق نہیں کہ کیا کیفیت ہند کی ہے[۱]

فقط واللہ تعالیٰ اعلم، رشید احمد عفی عنہ گنگوہی

غور کیجیے کہاں وہ جزم ویقین اور کہاں یہ تردّد وتذبذب۔ اس موخرالذکر فتویٰ پر جو تاریخ کندہ ہے وہ ۱۳۰۱ ہجری ہے۔ پہلے فتویٰ پر نہ دستخط ہیں اور نہ تاریخ۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ یہ اگر واقعی حضرت گنگوہی کی تحریر ہے بھی تو فتویٰ ثانی پر یقیناً برسوں مقدم ہوگی۔ پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ۱۳۰۱ ہجری سے برسوں پہلے تو حضرت کو ہند کی کیفیت کا بخوبی اور واضح طور پر علم تھا اور اس بنا پر آپ نے ملک کو دارالحرب قرار دے دیا۔ لیکن اس واقعہ کے برسوں بعد آپ کو ہند کی کیفیت کی خوب تحقیق نہیں رہی اور اس لیے اب ہند کو نہ دارالاسلام فرماتے ہیں اور نہ دارالحرب۔ کیا کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس ترتیب کو باور کر سکتا ہے!!

ایک تضاد:

اس کے علاوہ ایک اور اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ مفتی محمد شفیع صاحب کے شائع کردہ رسالہ کے خاتمہ پر مولانا محمد سہول صاحب عثمانی نے حواشی کے علاوہ ایک عبارت بھی لکھی ہے جس میں وہ حضرت گنگوہی کے حوالہ سے ہندوستان کو دارالامان کہتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"یہاں یہ بات ظاہر کر دینا بہت ضروری ہے کہ آج کل ہندوستان باستثناء اسلامی ریاستوں کے اگرچہ حضرت مجیب (مولانا گنگوہی) اور حضرت شاہ عبدالعزیز اور بعض دیگر اکابر کی تصریح کے مطابق دارالحرب ہے۔ مگر واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دارالامان ہے...... یہی وجہ ہے کہ یہاں سے مسلمانوں کو ہجرت

---

[۱] فتاویٰ رشیدیہ مطبوعہ قرآن محل کراچی۔ باب الربوا ص ۴۳۰۔

ضروری نہیں ہے۔ کاتب الحروف کے استفسار پر حضرت گنگوہی نے ایسا ہی شافہۃً فرمایا تھا جو بندہ کو خوب اچھی طرح سے یاد ہے۔" [۱]

ان تینوں تحریروں کو سامنے رکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مولانا گنگوہی نے ہندوستان کی نسبت فرمایا:

(الف) ہند دار الحرب ہے۔

(ب) ہند کے متعلق بندہ کو خوب تحقیق نہیں۔

(ج) ہند دار الامان ہے۔

اب "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟"

تاریخی پس منظر:

حقیقت یہ ہے کہ آپ اس معمّے کو اُس وقت تک حل کر ہی نہیں سکتے جب تک ان آرا اور افکار و خیالات کو گذشتہ دو ڈھائی سو برس کی تاریخ کے پس منظر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش نہ کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت پر زوال طاری ہوا تو کسی منزل پر پہونچ کر رُکا نہیں، بلکہ روز بروز حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں ہی جو عالمگیر کی وفات سے پانچ برس یعنی ۱۷۰۲ء میں پیدا ہوئے تھے پوری سوسائٹی "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم" کا مصداق بن گئی تھی۔ چنانچہ شاہی خاندان، اعیان و امرا، علما، صوفیہ، تجار، عوام اور خواص غرضکہ کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس کا ماتم شاہ صاحب نے تفہیمات میں خصوصاً اور دوسری کتابوں میں عموماً بڑے درد و کرب کے ساتھ نہ کیا ہو، اخلاقی زندگی کے حد درجہ فاسد ہونے کے ساتھ بدامنی اور شورش عام کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کی نہ جان محفوظ تھی اور نہ مال، ان کی عبادت گاہیں اور عورتوں کی عصمت و ناموس تک خطرہ میں تھی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

"دہلی والوں کے لیے زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔ بہت سے مسلمان تھے جو خودکشی کے ذریعہ ان مصائب و آلام ناگفتنی سے رستگاری کی سوچنے لگے تھے۔" [۲]

---

[۱] رسالۂ مذکور ص ۱۶۔

[۲] تاریخ مشائخ چشت ص ۳۳۶۔

اس وقت خوف وہراس اور دہشت وسراسیگی کا کیا عالم تھا! اس کا اندازہ شاہ ولی اللہ کے اس شعر سے ہوگا!

گاَنَّ نجوماً اومضت فی الغیاھب　　عیون الافاعی او رؤس لعقارب

ترجمہ :- جو ستارے تاریکیوں میں چمکتے ہیں وہ بھی ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا وہ سانپوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کے ڈنک۔

ہندوستان جو فقہا کی اصطلاح کے مطابق چھ سو برس سے دارالاسلام بنا چلا آرہا تھا۔ ان حالات نے شاہ صاحب جیسے مفکر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اب بھی دارالاسلام ہے یا نہیں ؟ اگرچہ ہماری نظر سے کہیں نہیں گزرا کہ شاہ صاحب نے ملک کو دارالحرب کہا ہو لیکن وہ ملک کا جو نقشہ کھینچتے اور اس کے جو حالات بیان کرتے ہیں وہ ہرگز کسی دارالاسلام کے نہیں ہو سکتے، اور اس بنا پر یہ بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے نیم شعوری ذہن میں ہندوستان کی نسبت دارالحرب میں منتقل ہو جانے کا تصوّر موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے پہلے نہایت اثر انگیز اور پُر جوش خطوط کے ذریعہ نجیب الدولہ اور نظام الملک کو فوجی طاقت کے ذریعہ اصلاحِ حال کی دعوت دی اور آخر کار جب اس سے کام نہیں چلا تو احمد شاہ ابدالی کو ایک نہایت مفصل خط لکھا جس میں ملک کی سیاسی حالت کو واضح طور پر بیان کرنے کے بعد مکتوب الیہ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کو مرہٹہ راج گردی سے نجات دلائے[۱]

ابدالی طوفان برق و باد کی طرح آیا مگر!

التفاتِ یار تھا اک خواب آغازِ وفا　　سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

میدانِ پانی پت میں اُس نے مرہٹوں کو شکستِ فاش دی اور جو کچھ ہاتھ لگا اسے لے لوا واپس چلا گیا۔ اس زبردست بھونچال سے عبرت پذیر ہو کر سنبھلنے کے بجائے مریضِ سلطنت کا حال اور ابتر ہو گیا، مرہٹوں کا اب وہ زور تو رہا ہی نہیں تھا، اس بنا پر نتیجہ یہ ہوا کہ ایک غیر ملکی اور اجنبی طاقت انگریزوں کی ابھرنی شروع ہوئی۔ یہ نہایت منظم، ترقی یافتہ اور حوصلہ مند طاقت تھی، اُس نے جنوب اور مشرق کی طرف سے بڑھتے بڑھتے پورے ملک میں اس درجہ اثر و نفوذ قائم کر لیا کہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں دہلی میں داخل ہو گئیں اور

---

[۱] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات : مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۴۱ تا ۵۳۔

اکبر و جہانگیر کے تخت و تاج کا وارث شاہِ عالم انگریزوں کا وظیفہ خوار قیدی بن کر رہ گیا۔

شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ:

یہ بالکل ایک نئی صورتِ حال تھی جو اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پیش آئی تھی اس بنا پر شاہ عبدالعزیز (از ۱۱۵۹ھ تا ۱۲۳۹ھ) جو ایک جماعت کے ساتھ اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ کی فکری امانت کے حامل اور ترجمان تھے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ چنانچہ بعض کتبِ فقہ سے کچھ عبارتیں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"اس شہر (دہلی) میں مسلمانوں کے امام کا حکم بالکل جاری نہیں ہے، بلکہ نصاریٰ کے سرداروں اور افسروں کا حکم بے دغدغہ جاری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں اگر بعض اسلامی احکام مثلاً جمعہ اور عیدین اور اذان اور گاؤکشی وغیرہ سے یہ لوگ تعرض نہیں کرتے ہیں تو پڑے نہ کریں مگر ان احکام کی اصل الاصول اُن کے نزدیک بالکل ہیچ اور ضائع ہیں۔ کیوں کہ مسجدوں کو جو خانۂ خدا ہیں بے تکلف مسمار اور خراب کرا دیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلم یا ذمی (غیر مسلم) انگریزوں سے پناہ لیے بغیر دلّی یا اُس کے گرد و نواح میں داخل ہونا چاہے تو ممکن نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شجاع الملک اور ولایتی بیگم بھی ان لوگوں کی اجازت کے بغیر اس شہر میں نہیں آسکتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
غرضکہ جب محدثوں اور صحابۂ کرام اور خلفائے عظام کی سیرت پر متجسس نگاہیں ڈالی جاتی ہیں تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ یہ شہر دارالحرب کا حکم رکھتا ہے"[1]

علاوہ ازیں ایک شخص نے دارالحرب میں سودی لین دین کے بارہ میں سوال کیا ہے تو حضرت شاہ صاحب نے اس کے جواب میں بھی دارالحرب اور دارالاسلام کی بحث چھیڑ دی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف اقوال و آراء نقل کرنے اور اپنی رائے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

---

[1] فتاویٰ عزیزی مطبوعہ مجتبائی پریس ص ۱۶ و ۱۷۔ یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ فتویٰ میں شاہ صاحب نے ورد ہلی سے کلکتہ تک انگریزوں کا عمل دخل بتایا اور اس لیے اس علاقہ کو دارالحرب کہا ہے، لیکن ملفوظات میں فرماتے ہیں "کلکتہ سے لاہور تک کا علاقہ دارالحرب ہے" ص ۱۲۳۔ اُردو ترجمہ شائع کردہ پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز۔ کراچی

"اور جب یہ ہے تو انگریزوں اور ان جیسے کافروں کے مقبوضات بلاشبہ دار الحرب ہیں"[1]

دیگر علما کے فتاویٰ :

شاہ عبدالعزیز صاحب اس فتوے میں منفرد نہیں تھے۔ بلکہ دوسرے علما کا فتویٰ بھی یہی تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے :۔

"جوں جوں ہماری (انگریزوں کی) طاقت مضبوط ہوتی گئی علما کے فتوؤں میں ہندوستان کا دار الحرب ہونا زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ مولوی عبدالحی صاحب جو مولانا شاہ عبدالعزیز کے بعد ہوئے صاف طور پر حکم لگاتے ہیں کہ "عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ سے لے کر دہلی اور ہندوستانِ خاص سے ملحقہ ممالک (یعنی شمالی مغربی سرحدی صوبے تک) سب کی سب دار الحرب ہے کیونکہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پا چکا ہے اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہ دار الحرب ہے"[2]

سید احمد شہید بریلوی کی تحریک :

ہندوستان کے انگریزی مقبوضات جن میں دلی بھی شامل تھی۔ اُن کے متعلق علمائے اعلام کی طرف سے دار الحرب ہونے کا اعلان ہو جانے کے بعد اب مسلمانوں کے لیے صرف دو راہیں ہی ہو سکتی تھیں، ایک یہ کہ اگر اُن میں ہمت ہے تو جہاد کریں اور دوسرے یہ کہ اگر جہاد نہیں کر سکتے تو ہجرت کر جائیں۔ دوسری شکل اختیار کرنا حد درجہ کی بزدلی اور نامردی کی بات ہوتی اس لیے پہلی صورت اختیار کی گئی۔ چنانچہ مدرسہ شاہ ولی اللہی کے تربیت یافتہ خصوصی سید احمد شہید بریلوی ۱۶ ارمئی ۱۸۲۶ء کو اپنے پانسو چھ سو معتقدین و مریدین کے ساتھ وطنِ مالوف سے روانہ ہوئے۔ مہینوں کے سخت دشوار اور کٹھن سفر کے بعد ایک جمعیتِ کثیر مہیا کی اور سرحد پہنچ کر ۱۸۲۷ء کے ابتدا میں جہاد کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان اگرچہ پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف تھا جہاں اسلامی شعائر کے علانیہ اظہار و بجا آوری تک پر پابندیاں تھیں

---

[1] فتاویٰ عزیزی ص ۱۸۵ [2] بحوالہ نقشِ حیات جلد دوم از مولانا سید حسین احمد مدنی حاشیہ ص ۴۔

لیکن سید صاحب نے کل ہند پیمانہ پر جو تیاریاں کی تھیں وہ صاف طور پر اس بات کی علامت ہیں کہ آپ کا اصل مقصد ہندوستان سے انگریزی اقتدار کو ختم کرنا اور اسے صحیح معنیٰ میں دارالاسلام بنانا تھا۔ چنانچہ آپ نے سرحد سے ریاست گوالیار کے مدارالمہام راجہ ہندو راؤ کو جو مکتوبِ گرامی لکھا ہے اُس میں فرماتے ہیں :-

"جناب پر یہ بات روشن اور ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ سمندر پار سے یہاں آکر بادشاہِ زمین و زمان ہو گئے ہیں اور جو سوداگر تھے وہ سلطنت کے مرتبہ کو پہونچ گئے ہیں، ان لوگوں نے بڑی بڑی امارتیں اور ریاستیں برباد کر دی ہیں اور ان کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا ہے (ان حالات کے باوجود) چونکہ اربابِ ریاست و سیاست گوشۂ گمنامی و بے عملی میں پڑے ہوئے ہیں اس لیے ہم چند فقیر و اہلِ مسکنت محض دین رب العٰلمین کی خدمت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں"

علاوہ ازیں مذکورۂ بالا ریاست کے ایک مسلمان عہدہ دار غلام حیدر خان کو جو خط لکھا ہے اُس میں بھی اسی مضمون کا اعادہ کیا ہے فرماتے ہیں :-

"آپ سردار والا مراتب راجہ ہندو رائے کو یہ امر ذہن نشین کرا دیں کہ ہندوستان کے اکثر شہر غیر ملکی لوگوں (انگریز) کے قبضہ میں جا چکے ہیں اور یہ ہر جگہ ظلم و زیادتی کر رہے ہیں۔ ہندوستانی ریاستوں کو انھوں نے برباد کر دیا ہے اور کوئی شخص ان کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے۔ ان حالات میں چونکہ بڑے بڑے اربابِ ریاست ان کے ساتھ نبرد آزمائی سے عاجز ہیں اس لیے ہم چند ضعیف و کمزور انسان کمرِ ہمت باندھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں"[1]

قدرت اپنی حکمتیں خود ہی جانتی ہے۔ یہ جہاد ناکام رہا، اور سید صاحب گھر سے ایسے رخصت ہوئے تھے کہ پھر واپس نہ آئے۔ ایک رہروِ راہِ طلب و جستجو کی غیرت و خودداری کی انتہا ہے!

---

[1] مجموعۂ خطوط قلمی بحوالہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا" از مولانا ابوالحسن علی ندوی صفحہ ۲۲۴-۲۲۶

نیز دونوں خطوں کے لیے دیکھیے "مکاتیب سید احمد شہید" (عکسی) مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ لاہور، ورق ۷۹، ۸۰۔

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

(غالب)

سید صاحب اپنے ہزاروں فداکاروں کے ساتھ جامِ شہادت نوش کر کے واصل بحق ہو گئے لیکن جو آگ ہزاروں دلوں میں روشن کر چکے تھے وہ دشمن کے آبِ شمشیر سے کہاں بجھ سکتی تھی اُن کے بعد تحریکِ مجاہدین کا ایک مکمل اور مربوط سلسلہ صادق پور سے درۂ خیبر تک قائم ہو گیا۔ اور اب ان کا براہِ راست مقصد انگریزوں کو ملک باہر کر کے اُس کی قدیم حیثیت کو بحال کرنا تھا، ادھر یہ مجاہدین اپنی جدوجہد میں مصروف تھے اور ادھر دلّی اور لکھنؤ میں تیزی سے وہ حالات پیدا ہو رہے تھے جن کے بطن سے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا ظہور ہوا۔

جہاد کا براہِ راست فتویٰ :

آخر انگریزوں کی روز افزوں زیادتیوں اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ کی بے چارگی و بے بسی کے باعث جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو دلّی کے "اخبار الظفر" میں کھلم کھلا یہ استفتا چھپا :

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلّی پر چڑھ آئے اور اہلِ اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرضِ عین ہے یا نہیں؟ . . . .

اس استفتا کا جواب مرتب کرنے کے لیے جامع مسجد دلّی میں علمائے کرام کا ایک اہم اجتماع ہوا۔ اور فتویٰ ذیل مرتب کر کے شائع کیا گیا :

"**الجواب** :- درصورتِ مرقومہ فرضِ عین ہے، اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اُس کی فرضیت کے واسطے چنانچہ اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے۔ بسبب کثرتِ اجتماعِ افواج کے اور موجود و مہیا ہونے آلاتِ حرب کے تو فرضِ عین ہونے میں کیا

شک رہا الخ[۴]

مولانا فضل حق کا فتویٰ[۱] :

اس وقت ہمارے سامنے فتویٰ کی جو نقل موجود ہے اُس پر ۳۸ دلّی کے علماء و مشائخ کے دستخط ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے اس پر دستخط نہیں ہیں، لیکن ان کا ایک الگ مستقل فتوائے جہاد تھا جس کا ذکر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، مولانا بلند پایہ عالمِ دین ہونے کے ساتھ رئیسانہ طور طریق زندگی رکھتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی ایمانی جرأت و جسارت اور دینی حمیت و غیرت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دلّی کی جامع میں نمازِ جمعہ کے بعد جہاد کے واجب ہونے پر ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی، اور اُس کے بعد جہاد کے ایک اور فتویٰ کا اعلان ہوا جس پر صدر الصدور مفتی صدر الدین خان آزردہ، مولانا فیض احمد بدایونی۔ ڈاکٹر مولوی وزیر خان اکبر آبادی اور دوسرے علما کے دستخط تھے۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں آگ لگ گئی اور خاص دہلی میں نوّے ہزار سپاہ جمع ہو گئی[۲] : اِدھر یہ ہوا اور دوسری طرف اکابرِ دیوبند جو سلسلۂ ولی اللہی کے بقیۃ السلف تھے یعنی حضرت حاجی امداد اللہ۔ مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی وغیرہم انھوں نے باقاعدہ جہاد کا فتویٰ دیا اور جنگ چھڑی تو اُس میں عملاً حصہ لے کر دادِ شجاعت دی۔

مسلمانوں کے لیے یہ جہاد تھا۔ لیکن استخلاصِ وطن کی غرض سے غیر مسلم بھی اُن کے ساتھ برابر کے شریک تھے، اور اس بناء پر اس کا اہتمام و انتظام بہت بڑے پیمانہ پر کیا گیا تھا لیکن با ایں ہمہ یہ کوشش بھی ناکام رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے باضابطہ طور پر تاج برطانیہ کے مقبوضات و مستعمرات میں شامل ہو گیا۔ اس جنگ میں ناکامی کے باوجود مجاہدین نے ہار نہیں مانی اور ان کی سرگرمیاں ایک خاص دائرۂ عمل میں برابر جاری رہیں اور ۱۸۶۳ء و ۱۸۶۸ء میں انگریزوں اور مجاہدین میں سخت معرکہ ہوا۔

---

[۱] جنگِ آزادی از خورشید مصطفےٰ صاحب رضوی ص ۵۶۸۔ [۲] الثورۃ الہندیہ ص ۱۵۶۔

اگرچہ ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اعلان ہو چکا تھا کہ اب کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا ہر شخص کو مذہبی آزادی ہوگی اور حصولِ معاش کے دروازے کسی پر بند نہیں ہوں گے لیکن شروع شروع میں اس اعلان پر خاطر خواہ عمل نہیں ہوا، اور مجاہدین کی سرگرمیاں بھی برابر جاری رہیں۔ لیکن انگریزوں کی حکومت میں جتنا استحکام پیدا ہوتا رہا۔ ملک میں امن وامان اور انفرادی و جماعتی آزادی کی فضا پیدا ہوتی رہی۔ اب مذہب آزاد تھا۔ دینی تعلیم و تبلیغ پر کوئی پابندی نہیں تھی، قانون مسلمانوں کے جان ومال کی حفاظت کی ضمانت کرتا تھا اور اس پر عمل بھی ہو رہا تھا۔ حصولِ معاش کے دروازے ہر ایک پر کھلے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو سرکاری دفتروں اور محکموں میں جگہیں مل رہی تھیں۔ غرض کہ اب انگریز کے ساتھ جنگ کا دَور ختم ہو چکا تھا۔ ملک میں ایک آئینی حکومت قائم تھی۔ اگرچہ بدیشی تھی اور یہ صورت پہلی صورتِ حال سے بالکل مختلف تھی۔ پہلے جنگ تھی۔ اب صلح تھی۔ پہلے حرب و ضرب کا دَور تھا اب امن وامان کا عہد تھا، اور اب مسلمانوں کے لیے موقع تھا کہ وہ تعلیمی اقتصادی اور مذہبی بنیادوں پر تنظیم کر کے اپنے لیے نشاۃِ ثانیہ کا سروسامان کریں۔

مولانا گنگوہی کے مختلف اقوال کے وجوہ:

سطورِ بالا میں ہم نے حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ سے لے کر اُنیسویں صدی کے ربعِ آخر تک کے حالات کا جو نہایت ہی مختصر اور سرسری جائزہ لیا ہے اُس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس پوری مدت میں ملک کے حالات یکساں نہیں رہے بلکہ ادلتے بدلتے رہے ہیں اور جو جو تغیر ہوتا رہا ہے بحیثیتِ مجموعی علماء کا اس ملک کے متعلق شرعی نقطۂ نظر بھی بدلتا رہا ہے۔ اس بنا پر مولانا گنگوہی سے اگر اس سلسلہ میں تین قول ثابت ہیں تو یہ حیرت کی بات نہیں بلکہ یہ حالات کے تغیر کا اثر ہے۔ چنانچہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا کا پہلا فتویٰ بزبانِ فارسی و شائع کردہ مفتی محمد شفیع صاحب یا تو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے کا ہے یا اُس کے فوراً بعد کا جب کہ پکڑ دھکڑ بڑے پیمانہ پر جاری تھی اور ادھر [illegible]

مگر مطلع بالکل صاف نہیں ہوا تھا تو مولانا کو اب پہلی رائے پر اصرار تو نہیں رہا۔ لیکن ساتھ ہی کھُل کر دار الحرب ہونے کی نفی بھی نہیں کر سکے۔ اور جیسا کہ فتاویٰ رشیدیہ میں ہے کسی قطعی بات کے کہنے سے معذرت فرمادی۔ پھر جب حالات اور زیادہ بہتر ہوئے امن وامان مکمل طور پر بحال ہوگیا اور مذہبی فرائض ومعمولات بلا خوف وخطر ادا ہونے لگے تو اب حضرت گنگوہی نے اس کو دار الامان قرار دیا۔

حضرت نانوتوی کا ارشاد :

مولانا گنگوہی نے تو ترقی کر کے ہندوستان کو دار الامان ہی کہا ہے لیکن مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے "ہندوستان میں سودی لین دین" پر بصورتِ مکتوب جو ایک نہایت پُر مغز اور بسوط رسالہ لکھا ہے اس میں متعدد روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

باعتبارِ روایاتِ منقولہ ہندوستان دار الاسلام ہست — ان روایات کے پیشِ نظر ہندوستان دار الاسلام ہے

اگرچہ اس معاملہ میں مولانا کو پورا اطمینان نہیں ہے۔ چنانچہ آخر رسالہ میں فرماتے ہیں :

دار الحرب بودن ہندوستان کلام چنانچہ — ہندوستان کے دار الحرب ہونے میں کلام ہے
از مطالعۂ روایاتِ منقولہ دریافتہ باشی — جیسا کہ گزشتہ روایاتِ منقولہ سے تم کو معلوم ہوا ہوگا
اگرچہ راجح نزد ہیچمدان ہمیں باشد کہ — اگرچہ اس ہیچمدان کے نزدیک راجح یہی ہے
ہندوستان دار الحرب است[1] — کہ ہندوستان دار الحرب ہے۔

لیکن چونکہ رسالہ کا اصل موضوع بحث دار الحرب میں "سودی لین دین" ہے اس بنا پر مولانا نے اس پر بڑی سیر حاصل بحث کے ضمن میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ ارشاد فرمائی ہے کہ "اوّل تو ہندوستان دار الحرب نہیں دار الاسلام ہے۔ لیکن اگر دار الحرب ہے بھی تو مسلمان کے لیے حسب روایاتِ فقہیہ یہ کہاں جائز ہے کہ وہ دار الحرب میں قیام کر کے سود کھاتا رہے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ سود دار الحرب میں لے اور اسے برتے دار الاسلام میں، جو لوگ ہندوستان کو دار الحرب قرار دے کر اس میں سودی لین دین کو جائز قرار دیتے ہیں۔ مولانا نانوتوی اُن پر ایک نہایت لطیف قسم کا طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

---

[1] قاسم العلوم جلد اول مشتمل بر مکتوب ہفتم و ہشتم۔ مطبع مجتبائی۔

"یہ بڑے عجیب وغریب قسم کے لوگ ہیں، جب ہم کہتے ہیں کہ اچھا! اگر ہندوستان دارالحرب ہے تو تمہیں ہجرت کرنی چاہیے۔ اس پر وہ کہتے ہیں کہ یہ دارالاسلام ہے۔ مگر جب ہم کہتے ہیں کہ یہاں سودی کاروبار جائز نہیں تو جھٹ بول اُٹھتے ہیں کہ یہ تو دارالحرب ہے، گویا چت بھی ان کی اور پٹ بھی ان کی، ہجرت سے بچنے کے لیے اس ملک کو دارالاسلام کہہ دیا اور سود کھانے کے لیے اسے دارالحرب قرار دے دیا۔ سبحان اللہ!"[1]

مولانا عبدالحی لکھنوی کا فتویٰ:

مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی اُن علما میں سے تھے جنھوں نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ میدانِ جنگ میں اُس سے مقابلہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران میں اور اس کے بعد مسلمانوں کی خصوصاً اور عام اہلِ ملک کی عموماً عظیم تباہی و بربادی، خستہ حالی و پامالی بچشمِ خود دیکھی تھی۔ اس بنا پر حالات خواہ کیسے ہی پُرامن ہوں بہرحال انگریز کے خلاف دلوں میں جو کدورت اور عہدِ گذشتہ کی جو تلخ یاد تھی اُس کی وجہ سے یہ حضرات ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق کوئی بات کہتے بھی ہیں تو رک رک کر اور کسی درجہ میں رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ لیکن مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی فرنگی محلی جن کی پیدائش ہی ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہے اُن کے لیے اس قسم کا کوئی حجاب ذہنی نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے بالکل صاف و صریح لفظوں میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی نفی کی، اور اس کے دارالاسلام ہونے کا اثبات کیا ہے۔

سوال یہ تھا کہ "جہاں تک عمل داری انگریزوں کی ہے۔ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو صرف صاحبین کے مذہب کے مطابق یا ابوحنیفہ کے مذہب کے موافق بھی" مولانا جواب میں فرماتے ہیں:

"ہندوستان دارالحرب نہیں ہے بلکہ دارالاسلام ہے۔"

اس کے بعد مولانا نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کتب فقہیہ سے طویل عبارتیں

---

[1] قاسم العلوم جلد اوّل مشتمل بر مکتوب ہفتم و ہشتم۔ مطبع مجتبائی دہلی ص ۲۹۔

نقل کیں اور ان کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں :

"ان عبارات سے اور ان کے امثال سے واضح ہے کہ دارالاسلام کے دار الحرب ہونے میں یہ شرط ہے کہ احکامِ کفر علانیہ جاری ہوں، اور احکامِ اسلام بالکلیہ موقوف کر دیے جائیں، اور شعائرِ اسلام اور ضروریات دین میں کفار مداخلت کرنے لگیں اور یہ شرط (متفق علیہ) ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور بھی دو شرطیں زائد کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس بلدہ میں اور دارالحرب میں کوئی بلدہ مملکتِ اہلِ اسلام کا باقی نہ رہے۔ دوسرے یہ کہ امان اوّل اٹھ جائے اور بامانِ کفار اقامت کی نوبت آئی ہو اور ظاہر ہے کہ بلادِ ہندوستان میں یہ مفقود ہے۔ اس لیے کہ شعائرِ اسلام میں ہنوز حکام کی طرف سے مداخلت اور ممانعت نہیں ہے۔ اگرچہ اکثر قضاۃ کفار ہیں اور خلافِ اسلام احکام جاری کرتے ہیں، مگر بہت سے امور میں مذہب سلام اور شرع کے موافق بھی فیصلہ کرتے ہیں۔ پس ہندوستان امام ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ کسی کے نزدیک دارالحرب نہیں ہے۔"[۱]

ایک اور فتویٰ :

اسی نوع کا ایک اور فتویٰ کلکتہ میں نواب عبداللطیف صاحب نے جب انھوں نے بنگال میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک شروع کی تھی۔ بعض علماء سے حاصل کر کے شائع کیا تھا۔ ان علما میں تحریکِ مجاہدین کے ممتاز عالم مولانا کرامت علی صاحب بھی شامل تھے اور فتویٰ میں کہا گیا تھا کہ " انگریزوں کے ماتحت ہندوستان دارالحرب نہیں ہے"[۲]

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمان " لذت کشی دردِ تہِ جام" کی زندگی بسر کر رہے تھے اس وقت مسلمانوں میں کوئی سیاسی تحریک نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو خفیہ یعنی انڈر گراؤنڈ۔ اور اُن کی تمام تر توجہات دیوبند اور علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر جیب و دامانِ تار تار پر بخیہ گری کے لیے وقف تھیں۔ کانگریس اور لیگ دونوں اگرچہ وجود میں آچکی تھیں لیکن اول الذکر

---

۱ ترجمۂ اُردو مجموعۃ الفتاویٰ مولانا محمد عبدالحیؒ مطبوعہ قیومی پریس کانپور جلد اول ص ۱۲۳ تا ۱۲۶۔

۲ ہندوستانی مسلمان (انگریزی) رام گوپال صاحب ص ۵ و ۶۔

کا مقصد انگریزوں کے ماتحت چند داخلی اور انتظامی اصلاحات اور موخر الذکر کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہ تھا اس بنا پر ہندوستان پر جب دار الحرب کی تعریف صادق نہیں آتی تھی تو مولانا عبدالحی کو لامحالہ اسے دار الاسلام ہی کہنا تھا۔[1]

تحریکِ ہجرت :

لیکن جن علما کے سینوں میں سید احمد شہید کی لگائی ہوئی آگ کے شعلے ابھی تک خاکستر نہیں ہوئے تھے وہ کب نچلے بیٹھنے والے تھے انھوں نے ایک فتویٰ کے ذریعہ ترکِ وطن کی تحریک شروع کر دی، مولانا غلام رسول مہر جو ہند و پاک کی جدید اسلامی تاریخ کے مبصر عالم ہیں بیان کرتے ہیں :

"تحریکِ خلافت کی تنظیم سے پیشتر علما کے فتویٰ سے یہاں ہجرت کی تحریک جاری ہوئی۔ میرے نزدیک اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے، اور دنیا بھر میں اسے بدنام کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسرے ملکوں میں یہ اطلاع پہونچتی کہ لاکھوں مسلمان ترکِ وطن پر مجبور ہوئے ہیں تو انگریزوں کے لیے نیک نامی کا کوئی موقع باقی نہ رہتا۔ یہ وقتی تحریک تھی"[2]

دوسری تحریکیں :

انھیں دنوں میں یعنی انیسویں صدی کے اواخر میں کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت و شمولیت کا مسئلہ اٹھا اور مولانا گنگوہی، مولانا محمود حسن اور لدھیانہ و دیوبند کے بہت سے علما نے کانگریس میں شرکت کے جواز اور سرسید کی قائم کی ہوئی جماعت "جماعتِ محبانِ وطن" نے شرکت کی ممانعت کا فتویٰ شائع کیا۔[3] پھر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی قیادت میں

---

[1] ہمیں اُن حضرات اور مشائخ کا بھی علم ہے جنھوں نے سفید فام فرمانروایانِ ہند کو ناصر الملۃ والدین اور حامیِ شریعتِ مصطفوی کہا ہے اور ترکوں کے مقابلہ میں بھیجے ہوئے ہندوستانی مسلمان فوجیوں کے بازوؤں پر تعویذ باندھے ہیں لیکن ان حضرات کو عوام میں کوئی سندِ اعتماد و اعتبار حاصل نہیں ہے۔ اس لیے ان کا ذکر غیر ضروری ہے۔ [2] ملاقاتیں : مرتبہ الطاف حسن صاحب قریشی ص ۱۸۶۔

[3] نقشِ حیات : از مولانا حسین احمد صاحب مدنی جلد دوم ص ۱۷۔

تحریک انقلاب یا بالفاظِ دِگر "ریشمی خطوط کی تحریک" شروع ہوئی۔ اس کے بعد خلافت اور پھر ترکِ موالات کی تحریکوں کا دَور آیا۔

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس پورے دَور میں جب کہ انگریزوں کے خلاف یہ تحریکیں چل رہی تھیں۔ ہندوستان کی نسبت ان علما کا جو تحریکوں سے وابستہ تھے شرعی طور پر کیا نقطۂ نظر رہا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ان تمام تحریکوں کا مقصد ہندوستان سے انگریزوں کا اخراج اور ملک کی آزادی تھا۔ لیکن اگر یہ تمام کوششیں آئین اور قانون کے اندر رہ کر کی گئی ہیں تو ظاہر ہے اس صورت میں ملک کی شرعی حیثیت کچھ اور ہوتی ہے، اور اگر ان تحریکوں میں حرب وضرب، تشدد اور قانون شکنی وغیرہ ان سب چیزوں کو تحریکوں کے بانی اور ہمدرد علما کی تائید ورضامندی کی سند حاصل تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُن کی نظر میں ہندوستان کی حیثیت پہلی حیثیت سے مختلف تھی۔

دارالعہد :

اس سلسلہ میں ہم صرف دو تحریریں پیش کر سکتے ہیں۔ ایک مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کی اور دوسری مولانا سید حسین احمد مدنی کی! حضرت شاہ صاحب کے متعلق اجمالاً گزر چکا ہے کہ آپ نے پشاور کے خطبۂ صدارت میں ہندوستان کو دارالامان کہا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اُسی موقع پر اشارہ کیا تھا۔ درحقیقت شاہ صاحب کی مراد دارالامان سے دارالعہد ہے۔ چنانچہ خطبۂ متعلقہ میں آپ نے حکومت اور مسلمانوں کے تعلقات کی شرعی نوعیت کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مولانا بدرِ عالم مرحوم حضرت شاہ صاحب سے نقل کرتے ہیں :

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی ہندوستانیوں کو انگریز کے ہاتوں میں قیدی سمجھتے تھے اور کسی معاہدہ کے قائل نہیں تھے۔ لیکن میرے نزدیک محقق بات یہ ہے کہ اگرچہ حکومت اور اہل ہند کے درمیان باقاعدہ کوئی معاہدہ نہیں ہے لیکن عملاً معاہدہ ہے۔ چنانچہ ہم اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں۔ اور جانی ومالی امور میں اُن سے مدد طلب کرتے ہیں اور

اُن تمام معاملات میں ہم ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں فریقین معاہدہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس بات کو کسی فقیہ نے نہیں لکھا ہے۔ مگر میرے نزدیک حکم یہی ہے اور اس پر ہی تمام تعریفات ہوں گی[۱]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب معاہدہ ہے تو پھر قومی تحریکوں میں توڑ پھوڑ مار پیٹ اور سول نافرمانی وغیرہ قسم کی جو چیزیں ہوتی ہیں اُن کے جواز کی کیا صورت ہوگی؟ کیوں کہ یہ سب نقضِ عہد میں داخل ہیں، اور اسلام میں نقضِ عہد سخت گناہ ہے، غالباً یہی سوال حضرت شاہ صاحب کے ذہن میں تھا۔ چنانچہ عبارت مذکورۂ بالا کے فوراً بعد جواباً فرماتے ہیں:

"یہ معاہدہ پہلے جان اور مال دونوں کے متعلق تھا۔ لیکن اب جان سے متعلق معاہدہ کو ہم نے اُن کے منہ پر دے مارا ہے (یعنی وہ ہماری جان کے ذمہ دار نہیں اور ہم اُن کی جان کے نہیں) البتہ اموال کے بارہ میں معاہدہ اب تک باقی ہے۔ چنانچہ انگریزوں کا مال چرانا جائز نہیں ہے۔ البتہ ہاں اگر ہم اس معاہدہ کو بھی توڑ دیں تو پھر مال کا چرانا بھی جائز ہوگا۔ لیکن ایسا اُسی وقت ہونا چاہیے جب کہ خود حکومت اپنا عہد توڑ دے۔ تاکہ جواب ترکی بترکی ہو۔ غدر اور بے ایمانی نہ ہو"[۲]

مولانا حسین احمد مدنی کا فتویٰ:

لیکن مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی بالکل اس کے برعکس ہندوستان کو دارالحرب اور ہندو اور مسلمان دونوں کو اس ملک میں انگریزوں کے ہاتھوں قیدی قرار دیتے ہیں۔ اور چونکہ مولانا کے نزدیک یہ ملک دارالحرب ہے اس لیے عورتوں کے سوا دشمنوں یعنی انگریزوں کی ہر چیز مسلمانوں کے لیے مباح ہے[۳]۔ ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

"ہندوستان دارالحرب ہے۔ وہ اس وقت تک دارالحرب باقی رہے گا جب تک اُس میں کفر کو غلبہ حاصل رہے گا۔ دارالحرب کی جس قدر تعریفات کی گئی ہیں اور جو شروط بیان

---

[۱] فیض الباری علی صحیح البخاری جلد ۲ ص ۴۹۹۔ [۲] فیض الباری علی صحیح البخاری جلد ۲ ص ۴۴۹۔

[۳] مکتوباتِ شیخ الاسلام حصہ اول مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ص ۱۸-۲۰

کی گئی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں[1]۔

اس سلسلہ میں یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ مولانا حضرت شاہ عبدالعزیز اور مولانا گنگوہی کے فتاویٰ کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں ؛

"ان پر (یعنی ان حضرات نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر) کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا"[2]

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ مولانا کے نزدیک ۱۸۰۳ء۔ اور پھر ۱۸۵۷ء کے ہندوستان میں اور ۱۹۴۰ء کے ہندوستان میں کسی قسم کا کوئی فرق ہی نہیں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا ایک سیاسی انقلاب پسند انسان تھے، انگریز دشمنی میں انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے۔ برطانیہ اور اس کی حکومت کو ایک آنکھ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر جب کبھی وہ بولتے ہیں تو قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ملک کی عام فلاح و ترقی سے قطع نظر خاص مسلمانوں نے ستر اسی برس کے اندر انگریزوں کے زیرِ سایہ ہر شعبۂ زندگی میں جو ترقی کی ہے۔ اور وہ بھی امن و امان کے ساتھ! مسلمانوں نے خود اپنے عہدِ حکومت کے گذشتہ دو سو برس میں نہیں کی تھی۔ چنانچہ راج گوپال اچاریہ کا بیان ہے کہ گاندھی جی نے ایک ظالم کی گولی کا نشانہ بننے سے دو برس پہلے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے راج میں ننانوے فی صدی آزادی رکھتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے تھے[3]۔

بہرحال مولانا محمد انور شاہ اور مولانا حسین احمد دونوں ایک ہی مکتبۂ فکر کے بزرگ اور ایک ہی استاد کے نامور شاگرد تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق دونوں میں جو اس قدر شدید اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ مولانا مدنی پر سیاسی انقلاب پسندی اور انگریز دشمنی کا غلبہ اس قدر شدید تھا کہ اس معاملہ میں فقیہانہ سنجیدگی و متانت اور تاریخ کا واقعاتی شعور مغلوب ہو جاتے تھے۔

---

[1] مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۷۵، ۷۶ [2] ایضاً۔ [3] انگریزی روزنامہ اسٹیٹسمین مورخہ ۳۱ رمئی ۱۹۶۶ء ص ۸ کالم ۳

مولانا اشرف علی تھانوی :

اس کے برخلاف مولانا اشرف علی صاحب تھانوی جو باعتبارِ تفقہ اپنے تمام معاصرین میں امتیازِ خاص رکھتے تھے۔ ان کو دیکھیے آپ نے امداد الفتاویٰ میں متعدد مقامات پر ہندوستان میں سود لینے کے مسئلہ پر گفتگو کی ہے لیکن ہندوستان کو کہیں دارالحرب نہیں لکھا۔ بلکہ آپ کا یہ ارشاد عام طور پر مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے ریل کا ٹکٹ نہیں خرید سکا اور اسی حالت میں اس نے سفر بخیر و خوبی طے کر لیا تو اب اسے چاہیئے کہ اتنی ہی مسافت اور اسی درجہ کا ایک ٹکٹ خرید کر چاک کر دے۔ تاکہ گورنمنٹ کا نقصان نہ ہو۔

بہ بین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

مولانا محمد حسین بٹالوی :

ہم نے یہاں تک صرف اکابر علمائے احناف کے ارشادات و بیانات پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ہندوستان میں جماعت اہلِ حدیث کے علماء بھی بڑی اہمیت کے مالک رہے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے بارہ میں ان علمائے اعلام کی آراء اس لیے اور بھی لائقِ توجہ ہیں کہ اس جماعت نے ہی سب سے زیادہ سرگرمی اور جوش کے ساتھ حضرت سید احمد شہید کے زیرِ قیادت انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے میں حصہ لیا تھا اور اسی بنا پر انگریز انہیں بدنام کرنے کی غرض سے وہابی کہتے تھے۔ بہرحال اس جماعت کے علماء میں مولانا ابوسعید محمد حسین لاہوری (جو عام طور پر بٹالوی بھی مشہور ہیں) بلند پایہ عالم اور صاحبِ تصنیف و قلم بزرگ تھے۔ لاہور سے اشاعۃ السنہ نامی ایک دینی پرچہ شائع ہوتا تھا۔ مولانا اُس کے اڈیٹر اور زمانہ کے اعتبار سے سرسید احمد خاں مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کے ہمعصر تھے۔ موصوف نے ۱۸۷۶ء میں ایک رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" کے نام سے لکھا تھا جو انہیں دنوں میں وکٹوریہ پریس میں طبع ہو کر شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ میں مولانا نے بڑی قوت اور زور سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان ہرگز دارالحرب نہیں، اور اس بنا پر انگریزوں کے خلاف جہاد جائز نہیں، چنانچہ لکھتے ہیں :

"جو مخالفینِ اسلام کسی کے مذہب سے تعرض کرنا جائز نہ رکھیں اور ناحق اہل اسلام کو بمقتضائے مداہنت خواہ بہ ہدایت مذہب خواہ بحکمِ عقل و اصولِ سلطنت بہت بُرا سمجھیں۔ جیسا کہ برٹش گورنمنٹ کا حال و چال ہے۔ ان سے مذہبی جہاد کرنا ہرگز جائز نہیں[1]"

یہ تو ہوئی جہاد کی بات! اب ملک کی شرعی حیثیت کے بارہ میں سُنیئے۔ فرماتے ہیں:

"جس شہر یا ملک میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی حاصل ہو وہ شہر یا ملک دارالحرب نہیں کہلاتا۔ پھر اگر وہ دراصل مسلمانوں کا ملک یا شہر ہو۔ اقوامِ غیر نے اس پر تغلب سے تسلط پالیا ہو (جیسا کہ ملک ہندوستان ہے) تو جب تک اُس میں ادائے شعائرِ اسلام کی آزادی رہے وہ بحکمِ حالتِ قدیم دارالاسلام کہلاتا ہے۔ اور اگر وہ قدیم سے اقوامِ غیر کے قبضہ و تسلط میں ہو۔ مسلمانوں کو انہی لوگوں کی طرف سے ادائے شعائرِ مذہبی کی آزادی ملی ہو تو وہ بھی دارالاسلام اور کم سے کم دارالسلم و الامان کے نام سے موسوم ہونے کا مستحق ہے[2]"

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مولانا محمد حسین صاحب نے جو کچھ اس رسالہ میں لکھا ہے وہ اس میں منفرد نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ رسالہ کے شروع میں (صفحہ ۳ و ۴) خود انھوں نے لکھا ہے یہ رسالہ انھوں نے ۱۸۷۶ء میں لکھ لیا تھا۔ لیکن اُس کو شائع کرنے سے قبل انھوں نے علمائے اسلام کی رائیں لینے کی غرض سے لاہور سے عظیم آباد پٹنہ تک کا سفر کیا اور اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"اور اکابر علمائے مختلف فرقہائے اسلام کو یہ رسالہ حرف بحرف سنا کر ان کا توافقِ رائے حاصل کیا اور بعض بلادِ ہندوستان و پنجاب میں جہاں راقم خود نہیں جا سکا۔ اس رسالہ کی متعدد کاپیاں بھجوا کر ان بلاد کے اکابر علما کا اتفاقِ رائے حاصل کیا"

---

[1] الاقتصاد فی مسائل الجہاد صفحہ ۵۰ [2] ایضاً ص ۱۹۔

مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی :

مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کس پایہ کے عالم تھے؟ اُن کی تصنیفات اور ترجمۂ قرآن سے ظاہر ہے، اُن کے نزدیک بھی ہندوستان دارالحرب نہیں تھا بلکہ اگر کسی وقت انگریزوں نے مسلمانوں کے سفرِ حج پر کوئی پابندی مذہبی تعصب کے بغیر کسی عام مصلحت سے لگائی تھی تو وہ ہرگز مداخلت فی الدین نہیں تھی ۔چنانچہ لکھتے ہیں ۔

"دارالحرب سے مراد وہ ملک ہے جس میں کافروں کی عملداری ہو اور وہاں کا حاکم مذہبی ضد سے مسلمانوں کو فرائضِ اسلامی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے بجالانے سے روکے اور منع کرے ۔ ایسے ملک میں مسلمانوں کو رہنا درست نہیں . . . . .
خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ہندوستان باوجودیکہ نصاریٰ کی عملداری ہے دارالحرب نہیں ہے اس لیے کہ یہاں بجاآوریِ فرائض میں کسی طرح کی روک ٹوک نہیں۔اور جو طاعون کی وجہ سے حاجیوں کو سفرِ حجاز سے روکا جاتا ہے تو یہ روکنا حکماً نہیں بلکہ عارضی اور صلاح و مشورہ کے طور پر ہے ۔اور اس سے زیادہ روک ٹوک تو مصر اور روم میں جاری ہے جہاں اسلامی حکومت ہے ۔کہ مرضِ طاعون متعدی ہے ایک سے اُڑ کر دوسرے کو لگ جاتا ہے ۔موسمِ حج میں لوگوں کا بہت سا اژدہام ہوگا تو خوف ہے کہ کہیں مری نہ پھیل جائے ۔پس اگر اس کو روک ٹوک سمجھا بھی جائے تو نہ اس لیے ہے کہ لوگ فریضۂ حج نہ ادا کریں۔ بلکہ اس لیے اور صرف اس لیے ہے کہ حاجیوں کی جانیں ضائع نہ ہوں" [1]



---

[1] ترجمۂ قرآن حاشیہ سورۂ نساء رکوع ۱۴۔

باب دوم:

آزاد ہندوستان اور اُس کا حکم

یہاں تک انگریزوں کے زمانہ کے ہندوستان کا تذکرہ تھا۔ اب ہمیں موجودہ آزاد ہندوستان کی شرعی حیثیت پر بحث کرنی چاہیے۔ کیوں کہ مولانا سید منت اللہ صاحب مونگیری نے خود اِس باب میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: "حضرت شاہ صاحب (مولانا کشمیری) نے اپنی اس تحریر میں سب سے پہلے کسی ملک کے دار الاسلام یا دار الحرب ہونے کی اصل بنیاد بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"باید دانست کہ مدار بودن بلدۂ وملکے دار الاسلام یا دار الحرب بر غلبۂ مسلمانان و کفارست وبس"

پھر اس اصول کو دلائل وشواہد اور حوالوں سے مستند وموثق فرمایا ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"این اصل را خوب ذہن نشین باید کرد۔ کہ جملہ مسائل از ہمین اصل برمی آیند وہمہ جزئیات این باب و اثر برہمین اصل ہستند"

اس کے بعد اسی اصل پر تفریعات ہیں اور مختلف جزئیات ومسائل بیان فرمائے ہیں اور بعض شبہات کا ازالہ کیا ہے اور آخر میں ہندوستان کی صورتِ حال بتلا کر اس ملک کے دار الحرب ہونے کا حکم ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"بہر حال تسلطِ کفار بر ہند بدان درجہ است کہ در ہیچ وقت کفار را بہ دار الحرب زیادہ نبود۔ واداء مراسم اسلام از مسلمانان محض باجازتِ ایشان است ولہٰذ مسلمانان عاجز ترین رعایا کسے نیست"

یہ سب کچھ لکھنے لکھانے کے بعد مولانا منت اللہ صاحب غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی یہ تحریر تقریباً چالیس برس پہلے کی ہے جب کہ انگریزوں کا دورِ حکومت تھا۔ اس تحریر میں دارالحرب کے لیے جو اصل بنیاد بتلائی گئی ہے اسے سامنے رکھ کر موجودہ ہندوستان کے متعلق بھی آسانی سے فیصلہ کن رائے قائم کی جا سکتی ہے۔" (۴)

وہ فیصلہ کن رائے کیا ہے؟ مولانا نے اگرچہ اُس کو گول مول رکھا ہے لیکن اس طرح کہ

غیر پھرتا ہے لیے یُوں ترے خط کو کہ اگر　　کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے (غالب)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک موجودہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ پھر امیر شریعت بہار اس میں منفرد نہیں ہے بلکہ سابق ناظم جمعیۃ علمائے ہند مولانا محمد میاں کی رائے بھی یہی ہے۔ چنانچہ ایک تحریر جو بصورتِ افتا ہے اُس میں فرماتے ہیں:

"یہ ملک (جنوبی افریقہ) یقیناً دارالحرب ہے۔ کیونکہ مسلمان دوسرے اقتدار کے ماتحت ہیں، خود ان کی حکومت نہیں ہے۔ نہ اُن کا کوئی ایسا با اختیار شرعی نظام یا کوئی ایسا نواب یا امیرِ شریعت ہے جس کو حکومت نے مسلمانوں کے معاملات کا اختیار دے رکھا ہو۔ ایسا ملک اصطلاحِ شریعت میں دارالحرب کہلاتا ہے۔"

اس کے بعد بعض کتبِ فقہ سے دو ایک عبارتیں نقل کی ہیں، اور پھر لکھتے ہیں:

"اگر آپ دار کا ترجمہ اسٹیٹ (ریاست) کر لیں تو دارالاسلام اور دارالحرب کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ غیر مسلم اسٹیٹ کو دارالحرب کہا جاتا ہے اگرچہ وہاں جنگ اور حرب نہ ہو بلکہ مسلمانوں سے صلح ہو یا امن و حفاظت کا کوئی معاہدہ ہو، یا اس اسٹیٹ کا قانون ایسا ہو کہ مسلمان اس قانون کے تحت محفوظ رہیں۔ اگر وہ مسلم اسٹیٹ نہیں ہے تو دارالاسلام نہیں ہے۔ بہر حال فقہ کی اصطلاح میں اس کو دارالحرب کہا جاتا ہے۔" (روزنامہ الجمعیۃ مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۶۰ء ص ۴ کالم ۱)

مولانا محمد میاں کی یہ تحریر اگرچہ جنوبی افریقہ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں ہے لیکن مذکورۂ بالا عبارت میں آپ نے دارالحرب کی جو تعریف کی اور اُس کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ موجودہ ہندوستان کا حکم بھی آپ کے نزدیک وہی ہے

جو جنوبی افریقہ کا ہے۔ یعنی وہ بھی دارالحرب ہے اور ہندوستان بھی دارالحرب!

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند:

جنوبی افریقہ کی ریاست کے بارہ میں ایک سوالنامہ دارالعلوم دیوبند میں بھی موصول ہوا تھا۔ یہاں کے دارالافتاء کی طرف سے اُس کا جو جواب گیا ہے اور جس پر مولوی محمد جمیل الرحمٰن نائب مفتی اور مفتی محمود احمد الصدیقی دونوں کے دستخط ہیں اور تاریخ یکم شعبان ۱۳۸۴ھ درج ہے۔ اُس میں بھی کم وبیش وہی بات کہی گئی ہے جو مولانا محمد میاں نے کہی ہے۔ اور اُس سے بھی استنباط یہی ہوتا ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"آپ کی (یعنی سائل کی) تحریر کے مطابق جمہوریۂ افریقیہ میں مسلمان اقل قلیل ہیں اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ جمہوریہ میں غلبہ وتسلّط غیر مسلموں کا ہے اور یہی مدار ہے دارالحرب ہونے کا۔"[1]

دارالحرب سے متعلق اوپر جو اقتباسات وبیانات نقل کیے گئے ہیں ان کو بیک نظر دیکھنے سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک کسی ملک کے دارالحرب ہونے کا دارومدار اس ملک میں غیر مسلموں کی اکثریت اور ان کے استیلا وتسلط پر ہے۔ لیکن معاملہ فی نفسہٖ اس قدر آسان نہیں ہے کہ دو چار عبارتیں فقہاء کی نقل کر کے اور اس پر دو تین جملے لکھ کر ختم کر دیا جائے۔ اس بنا پر ہم اس موضوع پر تفصیل سے بحث وگفتگو کریں گے، اور اس سلسلہ میں پہلے یہ دیکھیں گے کہ (۱) فقہاء کے نزدیک دارالحرب کی کیا تعریف ہے۔ اُس کی کیا پہچان اور کیا خصوصیات ہیں؟ (۲) دار کی قسمیں کتنی ہیں؟ اور ان اقسام میں باہم کیا نسبت ہے؟ اس کے بعد اس پر غور کریں گے کہ موجودہ زمانہ میں جب کہ قومیت اور وطنیت کا ایک نیا تصور پیدا ہوا ہے اور دنیا کی تمام مسلم اور غیر مسلم حکومتیں قومی اور بین الاقوامی معاملات میں اسی جدید تصور پر دساتیر حکومت میں عمل پیرا ہو رہی ہیں۔ اسلامی تعلیمات و احکام کی رو سے ان ممالک کا شرعی حکم کیا ہوگا۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جائے گا تو ہندوستان

---

[1] ماہنامہ الرحیم پاکستان بابت جون ۱۹۶۶ء ص ۶۸۔

کے دستور اور اس کے نظامِ حکومت کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا بہت آسان ہو جائے گا کیا آزاد ہندوستان مسلمانوں کے لیے شرعی طور پر کس قسم کا دار ہے اور مسلم ممالک کے لیے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

دارالحرب کی تعریف اور اس کی خصوصیات:

کتبِ فقہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فقہا کے ذہن میں دارالحرب دو قسم کے تھے۔ ایک وہ ملک جو شروع سے دارالحرب بنے چلے آرہے ہیں، اور ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اور دوسرے وہ ممالک جن کے حالات بدلتے بدلتے رہے ہیں، یعنی کبھی اُن پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور کبھی غیر مسلموں کا۔ اور جیسا کہ ساتویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ محمد بن محمود الاشتروسنی نے لکھا ہے۔ دراصل یہ دوسرے قسم کے ہی ممالک ہیں جو اُس زمانہ میں مسلمانوں کے قبضہ سے نکل کر دوسروں کے ہاتھوں میں پہنچ گئے تھے۔ جن کے باعث فقہاء کو دارالحرب اور دارالاسلام کی تعریف کرکے ان کی حد بندی کرنی پڑی[1]۔

ہندوستان اگر دارالحرب ہے تو ظاہر ہے پہلی قسم کا تو ہرگز ہو ہی نہیں سکتا، لامحالہ دوسری قسم کا ہی ہوگا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ فقہا کے نزدیک اس دارالحرب کی کیا تعریف اور اُس کی کیا خصوصیات ہیں:

امام ابوحنیفہ اور صاحبین کا اختلاف:

اس معاملہ میں امام ابوحنیفہ اور صاحبین دونوں آپس میں مختلف ہیں۔ امام ابویوسف اور امام محمد کا مذہب یہ ہے کہ جب کسی ملک پر مشرکین کا قبضہ ہو جائے اور وہ اُس میں احکامِ شرک ظاہر کرنے لگیں تو وہ ملک دارالحرب بن جاتا ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ اس پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ آپ کے نزدیک کسی ملک کے دارالحرب بن جانے کے لیے اُس میں تین شرائط کا پایا جانا

---

[1] کتاب الفصول ج ۱ ورق ۲ مخطوطہ دارالعلوم دیوبند۔ مصنف جن کا انتقال سنہ ۶۳۲ھ میں ہوا ہے۔ ماوراءالنہر کے اکابر مجتہدین و فقہا میں سے تھے۔ ان کی متعدد تصانیف ہیں جو بڑی پایہ کی سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا تذکرہ کشف الظنون ص ۸۴ میں ہے۔ اور مولانا عبدالحی لکھنوی نے الفوائد البہیہ مطبوعہ مطبع مصطفائی، لکھنؤ میں صفحہ ۸۲ و ۸۳ پر بھی ان کا تذکرہ لکھا ہے۔

ضروری ہے۔ امام صاحب اور صاحبین کی یہ رائے فقہ حنفی کی سب ہی مشہور کتابوں میں مذکور ہے۔ ہم صرف بسوط للسرخسی سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں :

والحاصل ان عند ابی حنیفة انما تصیر دارھم دار الحرب بثلاث شرائط احدھا ان تکون متاخمة ارض الترك لیس بینھا وبین ارض الحرب دار للمسلمین الثانی ان لا یبقی فیھا مسلم أمن بامانہ ولا ذمی أمن بامانہ۔ الثالث ان یظھروا احکام الشرك فیھا وعن ابی یوسف ومحمد اذا اظھروا احکام الشرك فیھا فقد صارت دارھم دار حرب[1]	غرض کہ ابو حنیفہ کے نزدیک غیر مسلموں کا ملک تین شرطوں سے دار الحرب بنتا ہے (۱) ایک یہ کہ یہ ملک تاتاریوں (اس وقت تک یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تھے) کے ملک سے ملا ہوا ہو یعنی اس ملک اور ارض حرب میں مسلمانوں کا کوئی ملک نہ ہو۔ (۲) دوسری یہ کہ اس میں کوئی مسلمان سابق امان کے ساتھ نہ ہو اور اسی طرح کوئی ذمی سابق امان کے ساتھ نہ ہو (۳) تیسری شرط یہ ہے کہ یہ لوگ شرک کے احکام ظاہر کریں، اس کے برخلاف ابو یوسف اور محمد کے نزدیک احکام شرک کے ظاہر کرتے ہی یہ ملک دار الحرب بن جاتا ہے۔

اس عبارت اور اسی جیسی دوسری عبارتوں سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ صاحبین کے نزدیک محض احکام شرک کے اظہار سے ملک دار الحرب بن جاتا ہے اور اس کے برخلاف امام ابو حنیفہ کی رائے میں کوئی ملک اس وقت تک دار الحرب نہیں ہو سکتا جب تک اس میں شرائطِ سہ گانہ ایک ساتھ نہ پائی جائیں اس بنا پر یہ اختلاف حقیقی ہے اور چونکہ امام صاحب کے شرائطِ سہ گانہ میں خود صاحبین کی شرط داخل ہے اس لیے ان دونوں مسلکوں میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے۔ یعنی جو ملک امام صاحب کے مسلک پر دار الحرب ہوگا وہ صاحبین کے مسلک پر بھی ہوگا۔ لیکن جو ملک صاحبین کے نزدیک دار الحرب ہو ضروری نہیں ہے

---

[1] المبسوط للسرخسی ج ۱۰ ص ۱۱۴ باب المرتدین۔

کہ امام صاحب کے نزدیک بھی ایسا ہی ہو۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اختلاف حقیقی نہیں بلکہ صرف نزاعِ لفظی ہے، کیونکہ صاحبین محض اظہارِ احکامِ شرک کو ہی دارالحرب ہونے کی بنیاد قرار دیتے ہیں تو یہ مطلق نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں ہر شخص کو مذہب کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان میں بھی تھی، اور اس حد تک تھی کہ اورنگ زیب عالمگیر ایسے متقشف اور متصلب فی الدین فرمانرواؤں کے خزانۂ شاہی سے مندروں کے لیے باقاعدہ گھی اور تیل مہیا کیا جاتا تھا۔ اور مندروں کے پجاریوں اور پنڈتوں کے ماہانہ وظیفے اور روزینے مقرر تھے۔ چند سال ہوئے صرف ایک شہر اجین سے عالمگیر کے ایسے چالیس فرمان دست یاب ہوئے تھے جن میں وہاں کے مہنتوں اور پنڈتوں کو جاگیریں عطا کی گئی تھیں۔ پس جب احکامِ شرک کا ظہور اسلامی حکومت کے ماتحت دارالاسلام میں بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا رہا ہے تو احکامِ شرک کا مطلقاً اظہار دارالحرب ہونے کی بنیاد کیوں کر قرار پا سکتا ہے؟ اس بنا پر لامحالہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اظہارِ احکامِ شرک سے صاحبین کی مراد اہلِ شرک کا قہر و غلبہ اور ایسا استیلا و استبداد ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی شعائر پر قائم رہنے اور مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی آزادی نہ رہے اور وہ اس معاملہ میں مقہور و مغلوب ہو جائیں۔ امام صاحب نے اظہارِ احکامِ شرک، جو اُن میں اور صاحبین میں مشترک شرط ہے۔ اس کے علاوہ باقی جو دو شرطیں اور مقرر کی ہیں وہ درحقیقت اسی استیلا، یا قہر و غلبۂ اہلِ شرک کی علامتیں ہیں نہ کہ مستقل کوئی دو جداگانہ چیزیں۔ اس تجزیہ کے بعد یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ امام صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ دراصل اُسی ایک چیز کی توضیح اور تشریح ہے۔ جسے صاحبین نے صرف ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اسی فتوٰی زیرِ بحث میں فرماتے ہیں:

الحاصل این اصل کلی وقاعدۂ کلیہ	خلاصہ یہ ہے کہ قاعدۂ کلیہ اس باب میں
است کہ دار الحرب مقہور کفار است	یہ ہے کہ دارالحرب وہ ہے جو مقہور کفار
و دارالاسلام مقہور اہلِ اسلام اگرچہ	ہو اور دارالاسلام وہ ہے جو مقہور اہلِ

دریک دار دیگر فریق ہم موجود باشد	اسلام ہو۔ اگرچہ ایک دار میں دوسرے دار
بلا غلبۂ و قہر و آن جا کہ قہر	کے لوگ بھی بدون غلبہ و قہر کے آباد ہوں
ہر دو فریق باشد آن ہم دارالاسلام	اور جس ملک پر دونوں فریق کا تسلط ہو
خواہد بود[1]۔	وہ بھی دارالاسلام ہی سمجھا جائے گا۔

اس عبارت سے نتیجہ یہ نکلا کہ ملک تین قسم کے ہیں :

(الف) جس پر غیر مسلموں کا ایسا قبضہ ہو کہ مسلمانوں کو اُس میں کوئی دخل ہی نہ ہو۔

(ب) جس پر مسلمانوں کا ایسا قبضہ ہو کہ غیر مسلموں کو اُس میں کوئی دخل ہی نہ ہو۔

(ج) جس پر مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو اقتدار اور تسلط حاصل ہو۔

ان تینوں میں پہلا ملک دارالحرب ہوگا اور باقی دونوں دارالاسلام کہلائیں گے۔

استیلاءِ تام کی حقیقت :

پس جب یہ ثابت ہوگیا کہ دارالحرب ہونے کا دار و مدار غیر مسلموں کے استیلاے تام اور ان کے بے شرکتِ غیرے غلبہ و قہر پر ہے تو اب یہ دیکھنا چاہیے کہ فقہا کے نزدیک اس استیلا اور غلبہ و قہر کا تحقق کب ہوتا ہے ؟ اور اس کا معیار کیا ہے ؟

فقہا نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اُس کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ استیلا صرف اُس صورت میں متحقق ہوتا ہے جب کہ ملک کے نظم و نسق میں مسلمانوں کو کوئی کسی قسم کا عمل دخل نہ ہو اور ان کو مذہبی آزادی بھی حاصل نہ ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی ملک میں مسلمانوں کو نظم و نسق میں دخل ہے۔ یا دخل تو نہیں ہے لیکن مذہبی آزادی بہر حال حاصل ہے۔ ان دونوں صورتوں میں "استیلاء" متحقق نہیں ہوگا۔ اور اس بنا پر وہ ملک شریعت کی اصطلاح میں دارالحرب نہیں کہلائے گا۔

اب ہم فقہا کی چند عبارتیں پیش کرتے ہیں جن سے ہم نے استیلاء کے مفہوم اور حقیقت کی تعیین و تشخیص میں یہ جو کچھ کہا ہے اُس کی تائید ہوگی۔ بدائع الصنائع میں ہے :

ان الامان ان کان للمسلمین	اگر ملک میں مسلمانوں کو مطلق امان

---

[1] فیصلۃ الاعلام فی دارالحرب و دارالاسلام ص ۴ و ۵۔

فیھا علی الاطلاق والخوف للکفرۃ	اور کفار کو مطلق خوف ہو تو وہ
علی الاطلاق فھی دار الاسلام	دارالاسلام ہے، اور اگر اس کے
وان کان الامان فیھا للکفرۃ	برعکس مکمل امان کفار کو ہو اور مطلق
علی الاطلاق والخوف للمسلمین	خوف مسلمانوں کو تو وہ دارالحرب
علی الاطلاق فھی دار الکفر[۱]۔	ہے ۔

یہ صورت ہوئی استیلائے تام کی ۔ اب لیجیے وہ دو صورتیں جن سے اس کی نفی ہوتی ہے ۔ تو ان میں سے پہلی یہ ہے کہ نظم ونسق میں دخل ہو، اس سلسلہ میں ردالمختار میں ہے:

لو اجریت احکام المسلمین	اگر مسلمانوں اور اہلِ شرک دونوں کے
واحکام اھل الشرک لا	احکام جاری ہیں (یعنی وہاں کی حکومت
تکون دار حرب[۲]۔	مشترک ہے) تو وہ ملک دارالحرب نہیں ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ مذکورۂ بالا عبارت میں صرف حکومت یا اقتدار میں شرکت کا ذکر ہے، اس چیز کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ شرکت کس درجہ کی ہے ۔ اس بنا پر اگر کسی ملک میں اقتدارِ اعلیٰ غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو تب بھی وہ ملک دارالحرب نہیں ہوگا !

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی جو جنگِ آزادی میں جمعیۃ علما کے سب سے بڑے سپہ سالار اور امیرِ کارواں تھے اس وسوسہ یا شبہ سے کیوں کر خالی الذہن ہو سکتے تھے ؟ چنانچہ آپ نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتویٰ پر کلام کرتے ہوئے صاف لفظوں میں تحریر فرمایا کہ:

"اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدارِ اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو لیکن مسلمان بھی بہرحال اس اقتدار میں شریک ہوں، اور ان کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا، اور ازروئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لیے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ

---

[۱] جلد ۷ ص ۱۳۱ – [۲] جلد ۳ ص ۲۷۵ –

کریں[1]۔

اب رہی دوسری صورت یعنی یہ کہ مسلمان نظم و نسقِ مملکت میں کوئی عمل دخل تو نہ رکھتے ہوں لیکن اُن کو مذہبی آزادی حاصل ہو تو ایسے ملک کے دارالحرب نہ ہونے کا اولین ماخذ ہجرت حبشہ ہے، جو نبوت کے پانچویں برس وقوع پذیر ہوئی تھی۔ یہاں مسلمان مہاجرین مہاجرات کو جو امن و امان اور آرام و اطمینان ملا صحابۂ کرام نے اُس پر تشکر کا اظہار اس طرح کیا کہ اُنھیں دنوں میں نجاشی کے ملک پر کسی دشمن نے حملہ کیا اور خود نجاشی اُس کے لیے میدان میں اُترا تو ان صحابہ نے نجاشی کی فتح کے لیے دعا کی اور جنگ کے لیے خود اپنی خدمات پیش کیں[2]۔

اس کے علاوہ ایک دوسرا ماخذ یہ ہے کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ہمیں کسی قبیلہ سے جنگ کرنے کے لیے بھیجتے تھے تو ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دیتے تھے کہ اگر تمہیں اس قبیلہ میں کوئی مسجد نظر آئے یا وہاں سے اذان کی آواز سنائی دے تو اُس پر حملہ نہ کرنا[3]۔

ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قبیلہ کے ساتھ غزوہ کرنے کے لیے اپنے آدمی بھیجے ہیں اُس کی عظیم اکثریت غیر مسلموں پر ہی مشتمل ہوگی۔ پھر اگر اس آبادی سے اذان کی آواز آتی یا وہاں کوئی مسجد نظر آتی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں اکا دکا مسلمان بھی آباد ہیں اور انھیں مذہبی آزادی حاصل ہے۔ محض اس بنا پر حضورؐ کا اس قبیلہ کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا حکم دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان تعداد میں کتنے ہی کم سہی، لیکن اگر ان کو مذہبی آزادی حاصل ہے تو اب یہ علاقہ "دارالحرب" نہیں رہا، ان دونوں ماخذوں کا اطلاق اُن علاقوں پر ہوتا ہے جو اب تک دارالاسلام نہیں بنے ہیں، لیکن جو علاقہ ایک مرتبہ دارالاسلام بن چکا ہے اُس کے دارالحرب نہ بننے کے ثبوت میں فقہا نے ان دو ماخذوں کے علاوہ دو دلیلیں اور پیش کی ہیں، ایک یہ کہ جس حکم کا وجود کسی علت پر مبنی ہوتا ہے تو جب تک وہ علت بالکلیہ مرتفع نہیں ہو جائے گی۔ حکم مرتفع نہیں ہوگا۔ اور دوسری دلیل یہ

---

[1] نقش حیات ج ۲ ص ۱۱۔ [2] سیرت النبی، مولانا شبلی ج ا ص ۲۴۰۔ [3] مسند امام احمد بن حنبل ترتیب ساعاتی ج ۱۴ ص ۵۹۔ یہ روایت بخاری، ابوداؤد اور ترمذی میں بھی سند کے اختلاف کے ساتھ ہے۔

ہے کہ الاسلام یعلو ولا یعلی۔ اس بنا پر جس ملک میں بھی اسلامی زندگی کے تھوڑے سے بہت آثار و علائم موجود ہیں وہ دار الحرب نہیں ہو سکتا:

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس کو ذہن میں رکھ کر اب آپ خود فقہاء کی زبان سے اس مسئلے کا بیان سنیے:۔ سرخسی فرماتے ہیں:

"امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایک ملک جو دار الاسلام رہ چکا ہے وہ دار الحرب اس وقت بنتا ہے جب کہ وہاں مشرکین کو مکمل قہر اور غلبہ ہو۔ اور مکمل قہر اور غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ وہاں ایک مسلمان یا ذمی بھی مامون نہ ہو۔" اصل الفاظ یہ ہیں:

ان بقی فیہا مسلم او ذمی آمن	اگر اس ملک میں ایک مسلمان یا ذمی بھی
فذالک دلیل عدم تمام	مامون بامانِ سابق ہے تو یہ اس کی دلیل ہے
القہر منہم[1]	کہ مشرکوں کو اس ملک میں مکمل قہر و غلبہ حاصل نہیں ہے۔

صاحبِ درمختار ملتقی الابحر کی شرح میں لکھتے ہیں:

ولا تصیر دار الاسلام دار	اور کوئی دار الاسلام اس وقت تک دار الحرب
الحرب الا بامورٍ ثلاثۃ:	نہیں بن سکتا جب تک کہ اس میں تین چیزیں
باجراءِ احکامِ الشرک	اکٹھا نہ پائی جائیں (۱) وہاں احکامِ شرک
و باتصالہا بدار الحرب و	جاری ہوں۔ (۲) وہ دار الحرب سے متصل ہو
بان لا یبقی فیہا مسلم او ذمی	(۳) اور اس میں ایک مسلمان اور ذمی بھی
بالامان الاول[2]	امانِ سابق سے نہ رہتا ہو۔

محمد بن محمود الاشتروسنی لکھتے ہیں:

وابو حنیفۃ یقول: ان ہذہ	اور ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ یہ ملک احکامِ
البلدۃ صارت دار الاسلام	اسلام کے جاری ہونے سے دار الاسلام

---

[1] المبسوط للسرخسی باب المرتدین ج ۱۰ ص ۱۱۴۔ [2] الدر المنتقی فی شرح الملتقی مطبوعہ دار العلوم دیوبند ص ۲۵۵۔

باجراء احکام الاسلام فیہا
فما بقی شیئٌ من احکام الاسلام
فیہا یبقی دار الاسلام علی ما
عرف ان الحکم اذا ثبت
بعلۃ فما بقی شیئٌ من احکام
العلۃ یبقی الحکم ببقائہ[1]

ہوگیا تھا تو اب جب تک اس میں اسلام
کا کوئی ایک حکم بھی موجود ہے ، وہ
دارالاسلام ہی رہے گا - کیوں کہ یہ
معلوم ہے کہ جب کوئی حکم ثابت ہوجاتا ہے
تو جب تک علت کا کچھ حصہ بھی باقی رہتا ہے
اُس کی بقاء سے حکم بھی باقی رہتا ہے -

اس کے بعد شرح سیر الاصل کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام ابوبکر رحمہ اللہ نے بھی یہی لکھا ہے - علاوہ ازیں شیخ الاسلام نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ :

ان دار الاسلام لا یصیر
دار الحرب اذا بقی شیئٌ من
احکام الاسلام وان زالت
غلبۃ اھل الاسلام -

دارالاسلام اُس وقت تک دارالحرب
نہیں ہوسکتا جب تک اُس میں اسلامی
احکام میں سے کچھ بھی باقی ہو - اگرچہ
اہلِ اسلام کا غلبہ نہ رہا ہو -

پھر صدر الاسلام ابوالیسر کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ :

ان دار الاسلام لا یصیر
دار الحرب ما لم یبطل
جمیع ما بہ صارت دار
الاسلام -

دارالاسلام اُس وقت تک دارالحرب
نہیں ہوسکتا جب تک وہ سب چیزیں
فنا نہ ہوجائیں جن کے باعث وہ
ملک دارالاسلام بنا تھا -

اس کے بعد فرماتے ہیں :

وذکر شیخ الاسلام الاسبیجابیؒ
فی مبسوطہ ان دار الاسلام
محکومۃ بکونہا دار الاسلام
فیبقی ھذا الحکم ببقاء حکم

اور شیخ الاسلام الاسبیجابیؒ نے اپنی
مبسوط میں بیان کیا ہے کہ جب دارالاسلام
پر دارالاسلام ہونے کا حکم لگ گیا تو اب
اگر ایک اسلامی حکم بھی باقی رہے گا تو یہ

---

[1] کتاب الفصول ج ۲ ورق ۲ مخطوطہ دارالعلوم دیوبند -

واحد فيها وذكر الامام اللامسي في واقعاته ان صارت دار الاسلام بهذه الاعلام الثلاثة فلا تصير دار الحرب مابقي شي منها۔ وذكر الشهيد الامام الاجل ناصر الدين في المنشور ان دار الاسلام صارت دار الاسلام باجراء احكام الاسلام فما بقيت علقة من علائق الاسلام ترجح جانب الاسلام وذكر في الملتقط ان البلاد التي في ايدي الكفار لا شك انها بلاد الاسلام لا بلاد الحرب لانها غير متاخمة لبلاد الحرب ولانهم لم يظهروا فيها احكام الكفر[1]

دار الاسلام ہونے کا حکم بھی باقی رہے گا اور امام لامسی نے اپنے واقعات میں بیان کیا ہے کہ ایک ملک جب تینوں علامتوں کے باعث دار الاسلام ہو گیا تو اب جب تک ان علامتوں کا ایک شمہ بھی باقی رہے یہ ملک دار الحرب نہیں ہوگا۔ اور شہید امام اجل ناصر الدین نے منشور میں لکھا ہے کہ ایک ملک جو احکامِ اسلام کے اجرا سے دار الاسلام بن گیا ہے تو جب تک کسی قسم کا بھی لگاؤ اس کو اسلام سے رہے گا جانبِ اسلام کو ہی ترجیح رہے گی۔ اور انھیں نے ملتقط میں بیان کیا ہے کہ جو علاقے کفار کے قبضہ میں ہیں وہ بے شبہ اسلامی علاقے ہیں نہ کہ حربی۔ کیوں کہ یہ علاقے بلادِ حرب سے متصل نہیں ہیں اور پھر ان علاقوں کے حکمرانوں نے ان میں احکامِ کفر کو غالب نہیں کیا ہے۔

مذکورۂ بالا عبارتوں میں آپ نے ملاحظہ فرمایا فقہائے کرام برابر یہ کہتے جا رہے ہیں کہ اگر اسلام کا ایک حکم بھی باقی ہوگا تو ملک دار الحرب نہیں ہوگا، اب یہ بھی سن لیجیے کہ یہ ایک حکم جس کا بقا "عدم اظہارِ کفر" کی دلیل ہے فقہا کے نزدیک اس کا معیار اور اس کی حد کیا ہے؟ یہی محمد بن محمود الحنفی الاشتروسنی فرماتے ہیں:

---

[1] کتاب الفصول ج ۱ ورق ۲۔

یجوز فیہ اقامۃ الجمعۃ و الاعیاد وتزویج الایامٰی[1]۔

اس ملک میں جمعہ اور عیدین کی نماز کا قائم کرنا اور بیوہ عورتوں کا نکاح کرنا جائز ہو۔

اسی سلسلہ میں فتاویٰ بزازیہ میں ہے:

واما البلاد التی علیھا ولاۃ کفار فیجوز فیھا ایضًا اقامۃ الجمع والاعیاد والقاضی قاضٍ بتراضی المسلمین وقد تقرران ببقاء شیٔ من العلۃ یبقی الحکم وقد حکمنا بلاخلاف فان ھذہ الدیار قبل استیلاء الکفار کان من دیار الاسلام وبعد استیلاء ھم اعلان الاذان والجمع والجماعات والحکم بمقتضی الشرع و الفتوی والتدریس شائعٌ بلا نکیر من ملوکھم فالحکم بانھا من دار الحرب لاجھۃ لہٗ نظرًا الی الدراسۃ و الدرایۃ۔ واعلان بیع الخمور واخذ الضرائب والمکوس و الحکم من النقض برسم التتار کاعلان بنی قریظۃ

اور جن علاقوں پر حاکم کفار ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں جمعہ اور عیدین کی نماز کا قائم کرنا گوارا ہے اور خود مسلمانوں کی آپس کی رضامندی سے وہاں قاضی بھی ہے اور یہ ثابت ہے کہ علت کے ایک جزء کے بقا سے حکم باقی رہتا ہے اور ہم نے بلا خلاف کے یہ حکم کیا تھا کہ کفار کے استیلا سے پہلے یہ علاقے دارالاسلام تھے اور ان کے استیلا کے بعد اذان دینا۔ جمعہ اور جماعت اور شریعت کے مطابق حکم دینا۔ فتویٰ دینا اور درس دینا عام طور پر مروج ہے اور کفار کے بادشاہوں کی طرف سے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ اس بنا پر ان علاقوں کو دارالحرب کہنے کی کوئی وجہ نہ عقلی ہے اور نہ نقلی اور شراب کا کھلم کھلا بیچنا اور خراج لینا اور ٹیکس وصول کرنا اور تاتاریوں کی رسم کا توڑنا ان سب کا حال ایسا ہی ہے جیسا کہ بنو قریظہ کا اعلانِ یہودیت اور محمد صلی اللہ

---

[1] ایضًا۔

بالیھودیۃ وطلب الحکم من الطاغوت فی مقابلۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی عہدہ بالمدینۃ و مع ذالک کانت بلدۃ اسلام بلا ریب[۱]۔

علیہ وسلم کے مقابلہ میں طاغوت سے حکم کا طلب کرنا حضور ص کے عہد مدنی میں۔ اور بلاشبہ ان سب چیزوں کے باوجود مدینہ بلاشبہ اسلام کا شہر تھا۔

فقہائے کرام کی ان تمام تصریحات کو سامنے رکھنے سے جو نتیجہ بلا کسی دغدغہ اور خدشہ کے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ صرف وہ ملک دارالحرب ہوگا جہاں کفر کا غلبہ اور استیلا بایں معنی ہو کہ نہ تو مسلمان اُس کی حکومت اور نظم و نسق میں شریک ہوں اور نہ ان کو مذہبی آزادی حاصل ہو، یعنی یہ دونوں چیزیں استیلاء و غلبہ کے اجزائے ترکیبی ہیں اور اس بنا پر یہ دونوں نہ ہوں یا ان میں سے ایک نہ ہو، بہر حال فوت الکل فوت الجز، فوت الکل کے قاعدہ کے مطابق استیلا متحقق نہیں ہوگا اور اس لیے حسب ذیل دونوں قسم کے ملک دارالحرب نہیں ہوں گے :

(الف) وہ ملک جس میں مسلمان شریکِ حکومت ہیں۔

(ب) وہ ملک جس میں مسلمان شریکِ حکومت تو نہیں البتہ انھیں مذہبی آزادی حاصل ہے۔

احتمالِ عقلی کے طور پر ایک تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان شریکِ حکومت تو ہیں۔ مگر ان کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے۔ لیکن ہم نے اس صورت کا ذکر قصداً اس لیے نہیں کیا ہے کہ اگر واقعی کسی ملک میں ایسے مسلمان موجود ہیں جو مذہبی آزادی کے نہ ہونے کے باوجود حکومت میں شریک ہیں تو وہ سچ مچ اس شعر کا مصداق ہیں :

اپنے ہاتھوں سے جو ڈھا آئیں خدا کے گھر کو ۔۔۔ ننگِ اسلام ہے ایسوں کا مسلماں ہونا

اور ظاہر ہے اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ملک دارالحرب ہے یا دارالاسلام!



---

[۱] بحوالہ اردو ترجمہ مجموعۃ الفتاوی مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی لکھنوی جلد اول ص ۱۲۲-

باب سوم:

ہندوستان کی دستوری حیثیت

ہندوستان کی دستوری پوزیشن:

اب آئیے ہندوستان کی دستوری پوزیشن کا جائزہ لیں۔

اس پر غور کرنے سے پہلے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ آزادی کے اس پس منظر کا پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ ملک کی آزادی کے لیے ہندو اور مسلمان دونوں ایک ساتھ ایک عرصہ تک سرگرم عمل رہے۔ دونوں نے یکساں قربانیاں دیں، جیل گئے۔ پٹے اور مارے گئے، جمعیۃ علما جو علمائے ہند کی نمایندہ جماعت تھی اُس نے آخر دم تک کانگریس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اور یہ سب کو معلوم ہے، کانگریس کا نصب العین آزادی کے بعد جمہوری نظام قائم کرنا شروع سے رہا ہے، اور علماء اس پر مہر تصدیق ثبت کرتے رہے ہیں۔ تو اب سوال یہ ہے کہ جمہوریت کے قیام کے بعد علمائے کرام کے نزدیک ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہوتی؟ وہ دارالحرب رہتا یا دارالاسلام؟ اگر دارالحرب ہوتا تو کیا علماء کے لیے جائز تھا کہ وہ ایک ایسے ملک کو جو (انگریزوں کے زمانہ میں) دارالحرب نہیں تھا اسے عظیم الشان قربانیاں دے کر دارالحرب بنائیں؟ اور اگر وہ دارالاسلام بنتا تو پھر تقسیم نے ملک میں اکثریت و اقلیت کے اعتبار سے آخر کونسی بنیادی تبدیلی پیدا کی ہے جس کے باعث ملک اگر تقسیم نہ ہوتا تو دارالاسلام ہوتا اور اب تقسیم ہوگیا ہے تو یہ دارالحرب بن گیا۔ آخر دستوری طور پر وہ کونسی چیز ہے جو تقسیم نہ ہونے کی صورت میں ہوتی اور اب نہیں ہے اور اس بنا پر پہلی صورت میں شرعی حکم کچھ اور ہوتا اور اب کچھ اور ہوگا!

صوبائی طور پر آبادی کم و بیش ہوتی لیکن مرکز میں پوزیشن تو بہر حال یہی ہوتی جس کا ذکر مسلم لیگ بار بار کرتی تھی۔

بہر حال کانگریس اور مسلم لیگ میں فرقہ وارانہ مسائل پر سمجھوتہ نہ ہو سکا اور انجام کار دو قومی نظریہ پیدا ہوا، اور اُس کی بنیاد پر ہی ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور اسی کی بنیاد پر پاکستان کو اسلامی حکومت قرار دیا گیا۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد ہندو مسلمانوں میں جو نہایت شدید قسم کی منافرت، دشمنی اور عداوت پائی جاتی تھی وہ اور پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں جن کے پیشِ نظر اغلب یہی تھا کہ ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہوتی! لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ یہاں پارلیمنٹری نظام جمہوریت اختیار کیا گیا۔

جمہوریت :

اس نظام کے ماتحت ہر شخص جو ہندوستانی ہے۔ مذہب، ذات پات، رنگ و نسل کے اختلاف کے باوجود یکساں شہری حقوق رکھتا ہے، پیشوں میں، ملازمتوں میں، عہدوں میں غرض کسی ایسی چیز میں جس کا تعلق اسٹیٹ سے ہے، مذکورۂ بالا چیزوں میں سے کسی کی بنیاد پر کوئی کسی قسم کا امتیازی برتاؤ نہیں کیا جائے گا، ہر شخص جو بالغ ہے اُس کو رائے دینے کا حق ہوگا۔ شہری حقوق اس ملک کے ہر باشندہ کو یکساں طور پر حاصل ہوں گے۔ عام حق رائے دہندگی (Adult Franchise) کے ذریعہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کا انتخاب ہوگا۔ اور یہی پارلیمنٹ اور اسمبلیاں گورنمنٹ بنائیں گی، اور اس طرح جو گورنمنٹ بنے گی اُس کی تشکیل میں تمام اہالیانِ ملک کا دخل ہوگا۔ گویا اصل طاقت بلا اختلافِ مذہب و ملت عوام کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہیں حکومت کے منصب پر بٹھا سکتے ہیں اور جب چاہیں اسے الگ بھی کر سکتے ہیں۔

مذہبی آزادی :

اب لیجیے مذہبی آزادی! اس سلسلہ میں دستور اعلان کرتا ہے کہ

(۱) ہندوستان کے سب لوگوں کو مساویانہ طور پر عقیدہ (Conscience) کی آزادی کا حق ہوگا اور ان کو اس بات کا بھی حق ہوگا کہ وہ آزادی کے ساتھ جس مذہب

کو چاہیں مانیں، اس پر عمل کریں اور اُس کی تبلیغ کریں۔

(۲) ہر مذہبی فرقہ یا طبقہ کو اس کا حق ہوگا کہ وہ مذہبی اور خیراتی کاموں کی خاطر۔

الف :۔ادارے قائم کریں اور چلائیں ۔

ب :۔مذہبی معاملات میں اُس کا وہ خود انتظام کریں۔

ج : اُس ادارہ کے لیے منقولہ یا غیر منقولہ جائداد حاصل کریں۔

د : اور اُس جائداد کا انتظام قانون کے مطابق وہ خود کریں[1]۔

جب یہ دفعات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوئیں تو اقلیتی فرقوں کے نمایندوں کی طرف سے ان کا بڑے جوش وخروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔چنانچہ ایک صاحب نے فرمایا :

"جناب ! یہ ہے اکثریت کا وہ عادلانہ اور مساویانہ برتاؤ جو اقلیتوں کو ان کے ساتھ دو قالب ویک جان بنا دے گا"

ایک اور صاحب نے کہا :

"میں اکثریتی فرقہ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اقلیتی فرقوں کے ساتھ بڑے عدل اور انصاف سے کام لیا ہے[2]"

دستور نے صرف یہی اعلان نہیں کیا ہے کہ ہر شخص کو مذہبی عقائد و اعمال اور اُس کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی ہوگی ۔بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ" حکومت مذہب کے معاملہ میں بالکل غیر جانبدار ہوگی اور اس بنا پر حکومت کے فنڈ سے جو تعلیمی ادارے چلیں گے اُن میں کسی مذہب کی تعلیم کا بندوبست نہیں ہوگا[3]!"

اقلیتوں کو طبعی طور پر یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ اُن کے بچے حکومت کے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پا کر کہیں ارتداد (indoctrination) کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس دفعہ سے اس اندیشہ کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

---

(1) The Constitution of India. Part III Article 25, 26

(2) Constitu... assembly debates vol. VII pp. 260-67.

(3) The Constitution of India Part III Article 28.

سپریم کورٹ :

اب سوال یہ ہے کہ دستور نے باشندگانِ ملک کو جو یہ حقوق دیے ہیں ان کی حفاظت اور نگرانی کون کرے گا۔ اور پھر اگر کسی دفعہ کی یا اس کے کسی لفظ کی مراد اور اس کی تشریح میں اختلاف ہو تو اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ جواب یہ ہے کہ دستور نے یہ سب اختیارات سپریم کورٹ کو دیے ہیں[1]۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت اور پارلیمنٹ یہ سب دستور کے وفادار اور اس کے پابند ہیں اور دستور کی تشریح و توضیح اور ظلم و زیادتی سے اس کی حفاظت، یہ سب سپریم کورٹ کا حق ہے اور اس بنا پر گورنمنٹ بھی مجبور ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں انڈین سپریم کورٹ کے نئے چیف جسٹس آنریبل کوکا سبا راؤ (Koka Subba Rao) نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ "سپریم کورٹ کا فرض یہ ہے کہ دستور نے جو بنیادی حقوق دیے ہیں کورٹ اُن کے اور سماجی انصاف کے درمیان تطبیق و توافق رکھے اور ہیئتِ منتظمہ (حکومت) کو راہ سے بے راہ نہ ہونے دے" اسی بنا پر سپریم کورٹ کے لیے غیر جانبدار اور بے خوف ہونا ضروری ہے[2]۔

دستور کا عملی پہلو :

اب غور کیجیے۔ دستور کی دفعہ جو شہری حقوق سے متعلق ہے وہ مسلمانوں کو حکومت کے کاروبار میں اکثریت کے ساتھ شریک کرتی ہے، اور مذہبی آزادی سے متعلق جو دفعہ ہے وہ ان کو مذہبی عقائد و اعمال اور مذہبی شعائر و رسوم کو بجا لانے کی، مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی، مذہبی تعلیم اور دینی امور کو سرانجام دینے کی غرض سے خود اپنے ادارے قائم کرنے اور ان کو حکومت کی مداخلت کے بغیر چلانے کی پوری آزادی دیتی ہے۔ شہری حقوق میں معاشی آزادی بھی شامل ہے اور اس لیے مسلمانوں کو اس بات کی بھی پوری آزادی حاصل

(1) The Constitution of India. Part III Article 32

(2) روزنامہ اسٹیٹسمین، ۲۸ جون ۱۹۶۶ء

ہے کہ حصولِ معاش کے لیے وہ جو پیشہ چاہیں اختیار کریں، ملازمت صنعت وحرفت، زراعت و فلاحت، ان میں سے ہر ایک کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے اور کسی اعتبار سے کہیں کسی جگہ اکثریت اور اقلیت میں کوئی کسی قسم کا فرق و امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے، چنانچہ جہاں تک حکومت میں مسلمانوں کی شرکت کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ صدرِ جمہوریہ اکثریت کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں تو نائب صدر ایک مسلمان ہے[1]۔ اسی طرح مرکز اور ریاستوں کی وزارتوں میں، سفارتوں میں، گورنروں میں، حکومت کے دفاتر میں چھوٹے ہوں یا بڑے۔ پارلیمنٹ میں، اسمبلیوں میں، عدالتوں میں، کارخانوں اور کمپنیوں میں یونیورسٹیوں میں، ہر جگہ مسلمان موجود ہیں، حکومت کی تشکیل میں ان کے ووٹ کا بھی دخل ہوتا ہے، بلکہ بعض علاقوں میں تو اُن کا ووٹ پاسنگ کی حیثیت رکھتا یعنی فیصلہ کن ہوتا ہے۔ اب رہی مذہبی آزادی! تو اس آزادی کی کونسی قسم ہے جو انھیں حاصل نہیں ہے۔ ملک میں لاکھوں مسجدیں ہیں جہاں سے پانچوں وقت اذان کی آواز بلند ہو کر فضا میں گونجتی ہے بعض بڑے بڑے شہروں کی خاص خاص مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا ہے اور اُس پر اذان ہوتی ہے، عیدالفطر، عید اور بعض اور مسلم تہواروں کی تعطیل حکومت کے کیلنڈر میں شامل ہے۔ ہر سال حج کے لیے کم وبیش سترہ اٹھارہ ہزار مسلمان حج کو جاتے ہیں اور اس مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لیے سہولتیں پیدا کرنے کے سلسلہ میں گورنمنٹ وہ سارے کام کرتی ہے جو اسلامی حکومتیں کرتی ہیں۔ حکومت کی مقرر کردہ دو مرکزی حج کمیٹیاں ہیں جدہ میں ہندوستانی سفارت خانہ پورے عملہ کے ساتھ حاجیوں کی دیکھ بھال اور ان کی خدمت کرتا ہے۔ مکہ اور مدینہ میں اور حج کے دنوں میں منیٰ اور عرفات میں ڈاکٹروں، لیڈی ڈاکٹروں اور دواؤں کا انتظام ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف صوبوں سے حجاج کی عام خدمت کے لیے اسکاؤٹس الگ جاتے ہیں، اس سال زرِ مبادلہ کے سخت گھاٹے کے باوجود حکومت نے دو کروڑ روپیہ کا اکسچینج حاجیوں کے لیے منظور کیا، پھر مسلمانوں

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین جو بعد میں صدر جمہوریہ ہند بھی ہو گئے تھے۔ (رشا، جہاں پوری)

کی مذہبی اور دینی تعلیم بالکل آزاد ہے، ملک میں چھوٹے بڑے سیکڑوں مدارس عربیہ اور ہزاروں مکاتب دینیہ ہیں جو بغیر کسی مداخلت کے اپنا کام کر رہے ہیں، دارالعلوم دیوبند جس کا بجٹ تقسیم سے پہلے اسّی نوّے ہزار ہوتا تھا اس سال اُس کا بجٹ دس لاکھ روپیہ کا ہے۔ علاوہ ازیں حیدر آباد کا دائرۃ المعارف جو اسلامی علوم و فنون کی اشاعت کا سب سے اہم ادارہ ہے وہ اور اس کے علاوہ کلکتہ، پٹنہ اور رامپور وغیرہ کے بعض مدارس عربیہ تمام تر حکومت کے خرچ اور اُس کے انتظام سے چل رہے ہیں۔ سنسکرت کی طرح عربی اور فارسی کے کسی ایک اسکالر کو بھی ہر سال صدر جمہوریہ کی طرف سے اعزاز ملتا ہے۔ تبلیغی جماعت، اسلامی جماعت اور دینی تعلیمی کونسل سب اپنے اپنے طریقہ پر کام کر رہی ہیں اور کوئی روک ٹوک نہیں۔

تقریر و تحریر کی آزادی :

ہمارا دستور اظہار ما فی الضمیر کی گارنٹی دیتا ہے۔ تو مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ یہاں کا مسلم پریس جس آزادی اور بیباکی کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات و مسائل اور اُن کی شکایات و تکالیف کے بارہ میں لکھتا اور حکومت پر تنقید کرتا ہے۔ بلاشبہ عرب اور افریقہ کے بہت سے مسلم ممالک کے اخبارات یہ جرأت و جسارت نہیں دکھا سکتے۔

معاشی آزادی :

دستور معاشی آزادی کی جو ضمانت کرتا ہے۔ مسلمان اس سے بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ملک میں گھوم پھر کر دیکھیے اللہ کے فضل و کرم سے صنعت و حرفت، تجارت، زراعت و فلاحت ان میں سے کوئی شعبہ نہیں ہے جس میں مسلمانوں کا حصّہ نہ ہو اور وہ ترقی نہ کر رہے ہوں۔ تقسیم کے بعد بتاشہ کی طرح بیٹھ گئے تھے لیکن اب وہ ایک نئی توانائی اور خود اعتمادی کے ساتھ ابھر رہے ہیں۔ ان کے اپنے مل بھی ہیں اور کارخانے بھی۔ بعض خاص خاص صنعتوں کے [illegible] میں اب تک ان کے نام کا سکّہ چلتا ہے۔ ان میں کروڑپتی بھی ہیں، لکھ پتی بھی [illegible] ٹے دکاندار بھی ہیں اور بڑے بھی! مال درآمد بھی کرتے ہیں اور برآمد بھی! پھر کثرت

سے فارم اور باغات والے بھی ہیں جو اپنے ہاں کی خصوصی پیداوار پہ گورنمنٹ سے کئی کئی انعام لے چکے ہیں۔

شکایات:

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ سے شکایات بھی ہیں اور بعض بہت شدید قسم کی! لیکن منطق کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہوتی ہے۔ اس لیے ہم ایک سالبہ کلیہ بناتے ہیں اور وہ یہ کہ "مسلمانوں کے ساتھ ہرگز کوئی انصاف نہیں ہو رہا ہے" لیکن کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ کلیہ صحیح ہے پس جب یہ صحیح نہیں تو لامحالہ اس کی نقیض یعنی موجبہ جزئیہ صحیح ہوگی اور اب قضیہ یہ ہوگا کہ "مسلمانوں سے کچھ انصاف ہو رہا ہے اور کچھ نہیں ہو رہا ہے" اب دیکھنا یہ ہے کہ مکمل انصاف اور دستور پر مکمل عمل کس کے حق میں ہو رہا ہے؟ آج آپ کو معلوم ہے۔ ملک کا کیا حال ہے؟ کونسی بیماری ہے جو ہمارے سماج میں نہیں ہے۔ کونسا آزار ہے جس میں ہمارا معاشرہ مبتلا نہیں۔ روگ کی وہ کونسی قسم ہے جو قوم کے رگ وپے میں ساری نہیں! آدمی پاگل ہوتا ہے تو ماں باپ اور بہن بھائی پر بھی ہاتھ اٹھا بیٹھتا ہے۔ پس مسلمانوں کو جو شکایات ہیں ان کو ملک کے عام حالات کے پس منظر کے ساتھ دیکھنا چاہیے۔ مسلمان ایک کُل کا جز ہیں۔ جب کُل ہی صحت مند نہیں تو جز صحت مند کیسے ہو سکتا ہے۔ ملک کے مختلف طبقات میں اگر ذات پات کے، زبان کے اور علاقائی حدبندی کے تعصبات پائے جاتے ہیں، اور ان کی بنیاد پر آئے دن شکست وریخت اور حرب وضرب کے ہنگامے برپا رہتے ہیں تو اگر مذہب کے نام پر بھی مفسدہ پردازوں کے ایک گروہ نے من مانی کرنے کی ٹھان لی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ بہرحال ملک کی عام ناگفتہ بہ اور تباہ کن صورتِ حال کے اصل اسباب حکومت کی نا اہلیت اور کمزوری اور عوام میں جمہوریت کی قدروں کا عدم احساس ہی دو ہیں۔ کم وبیش کا فرق ہے۔ لیکن مسلمانوں کو جو شکایات ہیں اُس کے اسباب بھی یہی ہیں، اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ مسلمانوں کو جو شکایات ہیں وہ محض اس لیے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں!! معاشرہ میں جب تک فساد ہے مسلمانوں کو بحیثیت

ایک فرقہ کے کامل اطمینان کبھی نہیں ہو سکتا۔ معاشرہ جب سدھر جائے گا تو مسلمانوں کو
بھی اطمینان ہو جائے گا اور مسلمانوں کو یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے آپ
کو سدھار لیں تو معاشرہ کے سدھارنے میں بھی وہ ایک بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔
علاوہ ازیں دستور نے جو حقوق مسلمانوں کو دیے ہیں ان پر اگر انہیں کوئی زد پڑتی ہے تو
اُس کے خلاف احتجاج کرنا یہ مسلمانوں کا آئینی حق ہے وہ انھیں کرنا چاہیے اور وہ کرتے
بھی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ نہ بھولیے کہ احتجاج کے حق کا آئینی ہونا یہ خود اس بات کی دلیل ہے
کہ آپ اس ملک کے شہری حقوق میں کسی سے کم نہیں، بلکہ برابر ہیں۔ مغلوب نہیں بلکہ
شریک ہیں۔ محکوم نہیں بلکہ ساتھی ہیں۔

اندیشے اور خدشے:

شکایات کے علاوہ بعض اندیشے اور خدشے بھی ہیں۔ مثلاً بعض مسلمان کہتے ہیں کہ
بے شبہ اس وقت تو مسلمانوں کو مذہبی آزادی مکمل طور پر حاصل ہے لیکن دستور میں ایک
دفعہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسٹیٹ تمام ملک میں ایک ہی سول قانون رائج کرنے
کی کوشش کرے گی[1] اگر ایسا ہوا تو مسلمانوں کے پرسنل لا کا کیا حال ہوگا؟ اور پھر مذہبی آزادی
کہاں رہے گی؟ جواب یہ ہے کہ اول تو پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں ایک سوال کے جواب
میں وزیر قانون اعلان کر چکے ہیں کہ سول کوڈ کسی فرقہ پر زبردستی تھوپا نہیں جائے گا۔
علاوہ ازیں آپ کو یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ ملک کے لیے جو عام سول کوڈ بنے گا وہ اسلامی
قوانین کے خلاف ہی ہوگا۔ ممکن ہے وہ اسلام کے مطابق ہو جیسے ہندو کوڈ بل کی متعدد
دفعات اسلامی تعلیمات کا چربہ ہیں۔ اور پھر اگر اس میں کوئی بات مسلم پرسنل لا کے
خلاف ہوئی بھی تو آپ کو پورا حق ہے اس کے خلاف آواز اٹھانے اور اگر ضرورت ہو تو
سپریم کورٹ کو کھٹکھٹانے کا! یاد رکھیے یہ حق سب مسلم ممالک میں بھی نہیں ہے۔
بہر حال فقہاء نے دار الحرب کی تعریف کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اور پھر ہندوستان میں

(1) The Consitution of India, Part IV Article 44.

دستوری طور پر مسلمانوں کو جو پوزیشن حاصل ہے ان سب کو پیشِ نظر رکھا جائے تو حسب ذیل تنقیحات پیدا ہوتی ہیں :

(۱) ہندوستان چونکہ ایک سکولر جمہوری ملک ہے اس لیے یہاں کسی مذہب یا کسی مذہبی فرقہ کی حکومت نہیں ہے، اس بنا پر فقہا کی اصطلاح میں " غلبۂ کفر" یہاں صادق نہیں آتا۔

(۲) شہری حقوق میں یکساں ہونے کے باعث مسلمان حکومت میں شریک ہیں۔

(۳) مذہبی آزادی کی دفعہ کے ماتحت مسلمانوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے۔

(۴) مسلمانوں کو معاشی اور تقریر و تحریر کی آزادی بھی حاصل ہے۔

(۵) انڈین یونین کے ڈپلومیٹک تعلقات تمام اسلامی ملکوں سے ہیں۔ اس کے علاوہ دوستانہ تعلقات و مراسم بھی ہیں کسی سے کم۔ کسی سے زیادہ !

(۶) انڈین یونین کی شمال مغربی سرحد مسلم ممالک سے متصل ہے۔ لاہور سے لے کر مراکو تک یہ سلسلہ چلا گیا ہے[1]

ان تنقیحات کی روشنی میں یہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ دار الحرب ہونے کے جو شرائط ہیں اور جو ایک لفظ " استیلاء " میں جمع ہو گئے ہیں (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں) ان میں سے چونکہ کوئی ایک شرط بھی نہیں پائی جاتی اس لیے ہندوستان ہرگز ہرگز دار الحرب نہیں ہے اور نہ اس جیسا کوئی اور جمہوری ملک جس میں غیر مسلموں کی اکثریت ہو دار الحرب ہو سکتا ہے۔

یہ مسئلہ اس درجہ صاف اور واضح ہے کہ اور تو اور پاکستان کے دو نامور محقق او فاضل اسلامیات نے بھی یہی لکھا ہے۔ چنانچہ جنوبی افریقہ کے متعلق استفتا دردا۔ عوام دیوبند کے دارالافتا کی طرف سے اُس کا جواب (جس کا ان صفحات میں ذکر ہو چکا ہے) پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر صغیر احمد معصومی ہندوستان اور اسی جیسی دوسری جمہوریتوں

---

[1] اور اب تو ہندوستان کی مشرقی سرحد پر بھی ایک مسلمان ملک (بنگلا دیش) بن گیا ہے۔ (شاہجہان پوری)

کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں :

"دارالحرب کی جو تعریف بیان کی گئی ہے۔ نیز قرونِ اولیٰ میں دارالحرب و دارالاسلام کے جو تعلقات تھے اور جو جنگی نتائج مرتب ہوتے تھے۔ ان سب پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آج کل کی سلطنتوں اور ریاستوں کو جہاں بدنظمی نہیں۔ بلکہ ایک خاص نظام قائم ہے اور مسلمان با امن و امان رہتے ہیں۔ بلکہ اپنی تعداد کے مطابق سیاسی امور میں بھی حصہ لیتے ہیں دارالحرب قرار نہیں دیا جا سکتا ہے[1]"

دوسرے صاحب پروفیسر محمد شریف مرحوم ہیں جنھوں نے لکھا ہے :

"ہندوستان کا دستور اگرچہ سکولر ہے لیکن اس میں عقیدہ، عمل اور مذہب کی جو آزادی دی گئی ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو اسلام دیتا ہے۔ اس بنا پر لفظوں کا فرق ہے ـــــ ورنہ پاکستان کی اسلامی ریاست اور ہندوستان، اسٹریلیا اور امریکہ کی سیکولر اسٹیٹ، یہ سب ایک ہی ہیں[2]"



---

[1] ماہنامہ الرحیم حیدرآباد (مغربی پاکستان) بابت جون ۱۹۶۳ء ص ۱۱، ۲۲۔

(2) Islamic and Educational Studies. P.6.(Institute of Islamic Culture, Lahore)

باب چہارم:

دار اور اس کی قسمیں

چند مغالطے اور ان کی وضاحت

اب سوال یہ ہے کہ اگر ہندوستان دار الحرب نہیں ہے تو کیا ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں جو دو عام مغالطے پیش آتے رہے ہیں انھیں دُور کر دیا جائے:

دار الاسلام اور دار الحرب میں نسبت کونسی ہے؟

پہلا مغالطہ یہ ہے کہ اسلام میں دار دو ہی ہیں، ایک دار الاسلام اور دوسرا دار الحرب اور ان دونوں میں نسبت تناقض کی ہے۔ یعنی اگر کوئی ملک دار الاسلام نہیں تو وہ دار الحرب ضرور ہوگا اور اسی طرح اگر وہ دار الحرب نہیں تو لازمی طور پر دار الاسلام کہلائے گا۔ یہ ایک ایسی ہمہ گیر غلط فہمی ہے جو ہمارے علماء کو شروع سے آج تک پیش آتی رہی ہے اور اسی غلط فہمی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن ممالک پر درحقیقت نہ دار الحرب کی تعریف صادق آتی ہے اور نہ دار الاسلام کی (مثلاً انگریزوں کے زمانہ کا ہندوستان کہ اُس میں مذہبی آزادی اور معاشی آزادی تو تھی لیکن اسلام کا قانون نافذ نہ تھا) اُن کے متعلق علماء میں اختلاف پیدا ہوگیا، کسی نے اُن کو دار الحرب کہا اور کسی نے دار الاسلام اور کسی نے کوئی ایک دوٹوک بات کہنے سے انکار ہی کر دیا، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ ان دنوں میں نسبت تناقض کی نہیں جو ایک کا ارتفاع دوسرے کے وجود کو مستلزم ہو، بلکہ یہ دونوں وجودی ہیں اور اس بنا پر ان میں تضاد کی نسبت ہے یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ملک دار الحرب بھی ہو اور دار الاسلام بھی۔ البتہ ایک ملک ایسا ہو سکتا ہے کہ نہ دار الحرب ہو اور نہ دار الاسلام۔

کیا دار العہد و الامن دار الحرب کے اقسام ہیں :

دوسرا مغالطہ جو در اصل پہلے مغالطہ کا ہی شاخسانہ اور نتیجہ ہے یہ ہے کہ دار الحرب سے ہجرت ضروری نہیں ہے۔ کیوں کہ دار الحرب دار الامان بھی ہو سکتا ہے اور دار العہد بھی۔ چنانچہ مولانا محمد سہول سابق صدر مفتی دار العلوم دیوبند مولانا گنگوہی کے مذکورۃ الصدر فتوی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دار الامان ہے۔ یعنی جس طرح حبشہ قبل ہجرت شریف کے باوجود دار الحرب ہونے کے دار الامان تھا اسی طرح سے آج کل ہندوستان بھی دار الامان ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو یہاں سے ہجرت ضروری نہیں ہے"

اس دعویٰ کے ثبوت میں فتح الباری اور اشعۃ اللمعات سے دو عبارتیں نقل کرنے کے بعد بطور حاصلِ بحث کے لکھتے ہیں :

"خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سب سے اوّل مدینہ منورہ ہی دار الاسلام بنا ہے اور اُس کے قبل دو ہی قسم کے دار الحرب تھے۔ دار الامان جیسے حبشہ اور دار خوف و شر جیسے مکہ مکرمہ[1]"

یہی رائے مولانا محمد میاں مراد آبادی کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

"غیر مسلم اسٹیٹ کو دار الحرب کہا جاتا ہے۔ اگرچہ وہاں جنگ اور حرب نہ ہو بلکہ مسلمانوں سے صلح ہو یا امن و حفاظت کا کوئی معاہدہ ہو یا اُس اسٹیٹ کا قانون ایسا ہو کہ مسلمان اس قانون کے ماتحت محفوظ رہیں۔ اگر وہ مسلم اسٹیٹ نہیں ہے تو دار الاسلام نہیں ہے"

اس کے بعد حبشہ کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"لیکن ہر دار الحرب سے نکل جانا ضروری نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] فیصلۃ الاعلام فی دار الحرب والاسلام، آخری صفحہ

نے کچھ صحابہ کو حبشہ بھیج دیا تھا، حالانکہ وہ بھی دارالحرب تھا۔ مگر وہاں مسلمانوں
کو امن مل جاتا تھا۔"[1]

مولانا نجم الدین اصلاحی جنھوں نے مکتوباتِ شیخ الاسلام کو مرتب کیا اور اُس پہ فاضلانہ حواشی لکھے ہیں انھوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

> "دارِ حرب کی دو قسمیں ہیں، دارالامن اور دارالفرار (اصل کتاب میں غلطی سے قرار چھپ گیا ہے) دارالامن وہ ہے کہ اُس میں مسلمان بادشاہ اور اسلامی قوانین نہیں ہیں، لیکن مسلمان وہاں عبادت میں آزاد ہیں جیسے ہندوستان یا صلح حدیبیہ کے بعد مکہ معظمہ۔ دارالفرار وہ ہے جس جگہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی نہ ہو .... خلاصہ یہ کہ دارالحرب کے اقسام میں سے دارالامن ہے جس کو دارالسلم بھی کہہ سکتے ہیں"[2]

اب ذرا غور کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ اگر کسی شخص نے اپنے لیے یہ اصطلاح بنالی ہے کہ وہ آگ کو برف اور برف کو آگ کہے گا تو بات دوسری ہے، کیونکہ لامشاحۃ فی الاصطلاح، ورنہ سچی بات یہ ہے کہ دارالامان اور دارالسلم کو دارالحرب کی قسم قرار دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ آگ کی قسم ایک ایسی بھی ہے جو جلاتی نہیں ہے، یا ایلوہ کی قسم ایک ایسی ہے جو کڑوی نہیں ہوتی، حرب و قتال اور سلم و امان (war and peace) دونوں متضاد ہیں، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک موضع میں بیک وقت دونوں کا اجتماع ہو جائے۔ اگر کسی چیز کو بیک وقت آپ سیاہ اور سفید اور کسی عورت کو بیک وقت بیوی اور اجنبیہ نہیں کہہ سکتے تو بے شبہ ایک ملک کو دارالحرب اور دارالامان معًا بھی نہیں کہہ سکتے، اصل یہ ہے کہ دارالامان اور دارالعہد، دارالحرب کی قسمیں نہیں ہیں، بلکہ قسیم ہیں، اور اس بنا پر دار کی دو قسمیں نہیں۔ بلکہ چار ہیں یعنی (۱) دار الاسلام (۲) دار الحرب (۳) دار الامان (۴) دار العہد، اور چونکہ یہ باہم قسیم ہیں اس لیے ایک قسم دوسری قسم کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

---

[1] اخبار الجمعیۃ دہلی مورخہ ۲۷ مئی سنہ ۶۲ء ص ۴ [2] مکتوباتِ شیخ الاسلام ج ۱ ص ۱۶۹ (حاشیہ)

غلط فہمی کی بنیادی وجہ :

اس غلط فہمی کی بنیادی وجہ ایک اور عام غلط فہمی ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی معاشرتی تعلقات کے بارہ میں ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ چونکہ اسلام اور کفر میں کبھی صلح نہیں ہوسکتی اور یہ دونوں طبیعت اور فطرت کے اعتبار سے باہم متحارب ہیں اس بنا پر جس ملک میں کفر کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوگا وہ طبعی طور پر دارالحرب ہی ہوگا، لیکن حق یہ ہے کہ دو چیزیں بالکل الگ الگ ہیں، ایک ہے نفسِ ایمان اور کفر کا باہمی تعلق اور دوسری ہے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دُنیوی اور معاشرتی تعلقات اور روابط۔ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے تو جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے

اور اُن میں مسالمت یا مصالحت ممکن نہیں ہے، لیکن جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات و روابط کا تعلق ہے تو اُس میں بڑی وسعت ہے، اُس کے متعدد اقسام و انواع ہیں اور معاشرتی و سماجی زندگی میں اسلام غیر مسلموں کے ساتھ بھی وہی اعلیٰ اخلاق و فضائل برتنے کا حکم دیتا ہے جن کا حکم وہ مسلمانوں کے ساتھ برتنے کا دیتا ہے، اسلام وحدتِ انسانیت کا بھی داعی ہے اور مساواتِ انسانی کا بھی، جس طرح اسلام کا خدا رب العٰلمین ہے اسی طرح اُس کا پیغمبر رحمۃ للعالمین ہے۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کو اصلاً باہم متحارب اور عہد و صلح کو ایک "امر عارض" قرار دیا جائے اور اسی ایک بنیاد پر دعویٰ کیا جائے کہ غیر مسلموں کا ملک اصلاً "دار الحرب" ہوگا۔ اس فرق کو آپ اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ شرک کو قرآن نے نجاست کہا ہے مگر مشرک کو جسمانی اور مادی اعتبار سے نجس کوئی نہیں کہتا۔ چنانچہ اُس کے ساتھ اُٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا اور ایک ہی مکان میں رہنا سہنا سب جائز ہے۔

ہم نے اوپر دار کی جو چار قسمیں بیان کی ہیں اُن میں پہلی قسم یعنی دارالاسلام تو خارج از بحث ہی ہے۔ اب رہیں باقی تین قسمیں تو اب ہم قرآن مجید اور تاریخ و سنت سے اُن کا ثبوت پیش کرتے ہیں :

اس سلسلہ میں ہمیں امورِ ذیل پر غور کرنا چاہیے :

(الف) از روئے قرآن غیر مسلموں کے ساتھ اصل حرب ہے یا صلح و آشتی ؟ اسی کو آج کل کی اصطلاح میں ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام پُرامن حیاتِ باہم (peaceful co-existence) یا "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو (live and let live)" کا قائل ہے یا نہیں ؟

(ب) اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے تو قرآن میں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی کتنی قسمیں ہیں ؟ اگر ایک نہیں بلکہ کئی قسمیں ہیں اور ہر قسم اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اور کوئی قسم کسی دوسری قسم کی تابع نہیں تو اس سے خود بخود یہ ثابت ہو جائے گا کہ تعلقات کی جتنی قسمیں ہیں اتنی ہی غیر مسلم ممالک کی قسمیں ہوں گی اور وہ سب مستقل بالذات ہوں گی۔

پُرامن بقائے باہم :

اب آئیے پہلے اس پر بحث کریں کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کے سلسلہ میں اصل حرب کو قرار دیتا ہے یا پُرامن بقائے باہم کو، ہر شخص جس نے قرآن پر ایک نظر بھی ڈالی ہے اچھی طرح جانتا ہے کہ قرآن میں فتنہ و فساد، شر انگیزی اور ظلم و جور کی جگہ جگہ سخت مذمت اور فتنہ انگیزوں کے لیے شدید وعید بیان کی گئی ہے یہاں تک کہ فرمایا گیا :

اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ[1] فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت (یعنی ناقابلِ برداشت) ہے

ایک مسلمان اور غیر مسلم میں مذہب کے سوا اور کسی چیز کا اختلاف نہیں ہے۔ اس بنا پر مذہب کی تبلیغ اور اس کی طرف دعوت جس طرح ہر انسان کا ایک طبعی حق ہے مسلمان کا بھی ہے۔

---

[1] سورۃ بقرہ آیت ۱۹۱

ساری دنیا کا ایک مذہب نہیں ہوسکتا:

لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں یاد رکھنے کے لائق ہیں، ایک یہ کہ فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ جس طرح ہر چیز میں یہاں تنوع اور رنگا رنگی ہے اسی طرح مذہب بھی کبھی ایک نہیں ہوسکتا اور اُس میں اختلاف و تنوع برابر قائم رہے گا۔ چنانچہ حضور پُرنور کو خطاب کرکے فرمایا گیا:

(۱) وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ ۔ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۔[۱]	اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک اُمّت ہی بنا دیتا اور یہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے بجز اُن لوگوں کے جن پر تیرے رب نے رحم کیا ہے، اور اسی کے لیے ان کو پیدا کیا ہے۔
(۲) وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۚ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۔[۲]	اور اگر تیرا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین میں ہیں وہ سب ہی ایمان لے آتے تو کیا (پھر بھی) آپ لوگوں پر جبر کریں گے یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔
(۳) وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ ۚ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۔[۳]	اگرچہ ان لوگوں کی روگردانی آپ پر بہت شاق ہے لیکن اگر آپ کے بس میں ہے تو (جائیے) زمین میں کوئی سُرنگ یا آسمان کے لیے کوئی زینہ تلاش کر لیجیے اور ان لوگوں کے لیے ایک نشانی لے آئیے (جسے دیکھ کر سب ایمان لے آئیں) اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر ہی دیتا۔ پس آپ نادان نہ بنیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ عام لوگوں کو خطاب کرکے فرمایا گیا:

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً	اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا۔

---

[۱] سورۂ ہود ۱۱۸-۱۱۹ [۲] سورۂ یونس ۹۹ [۳] سورۂ انعام آیت ۳۵

وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ[۱]

لیکن خدا نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اُس میں وہ تمہارا امتحان لیتا ہے اس لیے نیکیوں میں مسابقت کرو، خدا ہی کی طرف تم سب کو لوٹ جانا ہے اور پھر دنیا (میں) جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے تھے خدا ان سے تم کو آگاہ کرے گا۔

ان آیات کا منشا یہ ہے کہ جب یہ اختلافِ ادیان و مذاہب بحکم مشیتِ ایزدی قائم او برقرار رہے گا ہی تو تبلیغ و دعوت الی اللہ جو تمہارا فرض ہے وہ انجام دیے جاؤ لیکن محض اختلافِ مذہب کی بنیاد پر کسی سے شخصی مخاصمت اور دشمنی رکھنا دینِ حق کی تعلیم نہیں ہے ۔ مرض چھوٹا ہو یا بڑا بہر حال قابلِ نفرت ہے اور اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے، لیکن جو شخص آپ کے خیال میں مریض ہے وہ آپ کی نفرت کا نہیں بلکہ ہمدردی کا مستحق ہے۔

مذہب میں جبر و اکراہ نہیں ہے :

اور دوسری بات یہ ہے کہ مذکورۂ بالا آیات کے پہلو بہ پہلو ہی وہ آیات ہیں جن میں حضورؐ کو خطاب کرکے صاف صاف فرمایا گیا کہ آپ صرف مُبلّغ ہیں، مذکر ہیں، آپ نہ ان لوگوں پر مسلط ہیں اور نہ آپ ان کے اجارہ دار ہیں۔ پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ مذہب میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہو سکتا۔ حق اور ناحق دونوں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے گئے۔ اب جس کا جو جی چاہے کرے۔ جو جیسا کرے گا خدا کے ہاں ویسا ہی پائے گا۔ چنانچہ آیاتِ ذیل پر غور فرمائیے :

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ اِنَّ اِلَيْنَآ

پس آپ نصیحت کیجیے، آپ نصیحت کرنے والے ہی ہیں آپ ان پر مسلط نہیں ہیں۔ مگر ہاں جو شخص سرکشی اور کفر کرے گا تو اللہ اُس کو بڑا عذاب دے گا۔ بے شبہ ہماری ہی طرف ان سب کو آنا

---

[۱] سورہ مائدہ آیت ۴۸ -

إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝ (الغاشیہ، آیت ۲۱ تا ۲۶) | ہے۔ اور ہمارے ذمہ ہی ان کا حساب ہے۔

یہ آیات مکی ہیں جب کہ مسلمان کمزور اور تعداد میں بہت کم تھے، لیکن مدینہ میں جب اُن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ ایک عظیم الشان طاقت و قوت کے مالک تھے، وہاں بھی تبلیغ کے سلسلہ میں جو احکام نازل ہوئے وہ سب یہی تھے، چنانچہ مدنی آیات ہیں:

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ (النور، آیت ۵۴)

آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ لیکن اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو پیغمبر اپنے بوجھ کا ذمہ دار ہے اور تم لوگ اپنے بوجھ کے، اور اگر تم پیغمبر کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے اور پیغمبر کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہونچا دینا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ آیت ۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے متمایز ہوگئی ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ (التوبہ آیت ۱۲۹)

اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو اے محمدؐ آپ کہیے: "میرے لیے اللہ کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے، میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔"

اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن میں جبر و اکراہ کی نفی ہی نہیں کی گئی بلکہ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے کہ جو ایمان جبر و اکراہ سے قبول کیا جائے اور اس میں

دل کی خواہش اور رضامندی کو دخل نہ ہو اُس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ پس جب زبردستی کا ایمان معتبر ہی نہیں ہے تو پھر جبر و اکراہ کی اجازت کیوں کر ہو سکتی ہے۔ ارشادِ حق بنیاد ہے:

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ج وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (مومن، آیت ۸۵)	پس جب ان لوگوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو بولے "ہم ایک خدا پر ایمان لے آئے اور جن چیزوں کو خدا کے ساتھ ہم شریک مانتے تھے اب ہم ان کا انکار کرتے ہیں" لیکن ہمارا عذاب دیکھنے پر اُن کا ایمان لانا اُن کے لیے نفع بخش نہیں ہوا۔ اللہ کی اپنے بندوں کے ساتھ دیرینہ سنت یہی ہے اور ایسے مواقع پر کافر بہت نقصان اٹھاتے ہیں۔

عذابِ الٰہی کی طرح موت بھی ایک جبر ہی ہے اس بنا پر جس طرح نزولِ عذاب کے وقت ایمان لانا معتبر نہیں تھا اسی طرح موت کے شکنجہ میں پھنس کر ایمان کے اقرار کا کوئی اعتبار نہیں ہے، چنانچہ فرمایا گیا:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ: اِنِّيْ تُبْتُ الْئٰنَ (النساء، آیت ۱۸)	اور توبہ اُن بدکاروں کی معتبر نہیں ہوتی جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اُن میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے "میں نے اب توبہ کر لی ہے۔"

اگر اسلام میں جبر جائز ہوتا تو سب سے پہلے حضرت عمرؓ اپنے غیر مسلم غلام کو مسلمان بناتے۔

اب شر و فساد، ظلم و جور کی مذمت وحدت انسانیت، مساوات انسانی اور عدل و انصاف کی تاکید کے بارہ میں جو آیات ہیں اُن کو مذکورۂ بالا آیات کے ساتھ ملا کر پڑھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض اختلافِ مذہب کے باعث غیر مسلموں کے ساتھ اُن

مکارمِ اخلاق اور فضائلِ علیا سے گر کر معاملہ کرنا جن کا حکم اسلام دیتا ہے جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ بتوں کا سب وشتم، مذاق اڑانا، پھبتی کسنا، نام بگاڑنا تک جائز نہیں ہے۔ پس جب یہ ہے تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ ہر غیر مسلم کو جو مسلم مملکت میں نہیں رہتا اُس کو حربی اور اُس کے ملک کو بہر حال دار الحرب کہا جائے۔

اسی سے یہ ثابت ہوگیا کہ اسلام "پُرامن بقائے باہم" کا سرگرم حامی اور داعی ہے اور اُس کے فلسفۂ حیات میں اصل امن وامان، مصالحت ومسالمت ہے اور جنگ فقط ایک امرِ عارض وزوال پذیر ہے ٹھیک اسی طرح جیسے صحت، خوشی، نیکی زندگی کی اصل حقیقتیں ہیں اور ان کے بالمقابل مرض، درد وغم اور بدی عارضی امور ہیں۔ چنانچہ ایک آیت میں دنیا کے سب لوگوں کے ساتھ امن وامان اور صلح وآشتی کے ساتھ رہنے کا عہد وپیمان کرنے کا حکم صاف لفظوں میں دیا گیا ہے اور اس راہ میں جو وساوس و خطرات پیش آتے ہیں اُن سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا	اے ایمان والو! تم سب صلح وآشتی میں
فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا	داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے نقش قدم پر
خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ	مت چلو، وہ بے شبہ تمہارا کھلا ہوا
عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ (البقرہ رکوع ۲۵)	دشمن ہے۔

ضرب وحرب اور قتال کا حکم:

مرض، درد وغم اور بدی امور عارضی سہی لیکن بہر حال یہ بھی اس دنیا کی حقیقتیں ہیں۔ اور جب تک ان سے حفاظت اور بچاؤ اور کم از کم ان پر قابو پانے کا بندوبست نہ ہو زندگی میں سکھ اور چین میسر نہیں آسکتے، اس بنا پر اگر انسان کے لیے فرشتہ بننا ممکن نہیں ہے تو جنگ بھی ناگزیر ہے۔ چنانچہ قرآن میں جنگ کے احکام ومسائل اور اُس کے متعلقات کا بیان بھی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ جنگ کا مقصد فتنہ وفساد کی

بیخ کنی ہے اور یہ فساد خود مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف اور غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف دونوں طرح ہو سکتا ہے، قرآن نے ان دونوں قسموں کو بیان کر کے ان کے احکام بھی بتائے ہیں، پہلی قسم کے متعلق ارشاد ہے :

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ بیٹھیں
اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَاج	تو تم ان کے درمیان صلح و صفائی کرا دو، لیکن
فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى	اگر ایک گروہ نے دوسرے گروہ پر زیادتی کی
الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ	ہے تو اب تم اس گروہ سے جنگ کرو جو زیادتی
حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۔	کر رہا ہے، اور اُس وقت تک جب تک یہ
(الحجرات رکوع ۱)	گروہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ نہ آئے ۔

اس آیت میں مسلمانوں کی باہمی جنگ کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں :

(الف) دونوں گروہ کسی غلط فہمی یا اجتہادی خطا کے باعث لڑ رہے ہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ دونوں میں غلط فہمی رفع کر کے، صلح صفائی کرائی جائے۔

(ب) ایک گروہ حق پر ہے اور دوسرا باطل پر۔ ایک مظلوم ہے اور دوسرا ظالم: اس کا یہ حکم ہے کہ ظالم سے جنگ کی جائے اور اسے انتہا تک پہونچایا جائے۔

اور اگر یہ فساد اور شر غیر مسلموں کی طرف سے ہو تو پھر اُن سے بھی جنگ کرنی چاہیے۔ لیکن اسلام کے فلسفۂ اخلاق میں جنگ کی حیثیت "علاج بالمثل" یا "جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا" کی ہے۔ اس بنا پر حکم ہے کہ مقصد جب حاصل ہو جائے تو فوراً ہاتھ روک لو اور ہرگز حد سے آگے قدم نہ رکھو، ورنہ خدا کے ہاں سخت پکڑ ہوگی۔ آیات ذیل ملاحظہ فرمائیے :

(۱) وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ	اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں تم اُن لوگوں
يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ	سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور
اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝	زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں

(البقرۃ - رکوع ۲۴) کو پسند نہیں کرتا۔

(۲) فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ (البقرہ رکوع ۲۴)

اور جس نے تم پر دست درازی کی ہے تم بھی بس اتنی دست درازی اُس پر کرو۔

(۳) وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ط (النحل۔ رکوع ۱۶)

اور اگر تم ان کو عذاب دینے لگو تو بس اتنا عذاب دو جتنا کہ تم کو دیا گیا تھا۔

اس سے بڑھ کر حسن اخلاق۔ شرافتِ نفس اور لطف و کرم کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ اگرچہ اس آیت میں برابر سرابر بدلہ لینے کی اجازت ہے، لیکن پھر بھی صبر کا مرتبہ بہت اونچا بتایا گیا ہے :

وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝

اور اگر تم صبر کرو تو بے شبہ وہ صبر کرنے والوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔

غیر مسلموں کی قرآن میں تین قسمیں :

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام میں جنگ کا مقصد کیا ہے ؟ وہ کیوں مشروع کی گئی ہے ؟ اور اُس کے کیا حدود ہیں ؟ تو اب یہ معلوم کرنا چاہیے کہ قرآن میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرنے کے سلسلہ میں جنگ، صلح اور امن کی تین حالتیں بیان کی گئی ہیں، انھیں تین حالتوں کے اعتبار سے اُن کی تین قسمیں ہیں اور ہر قسم کے لیے الگ الگ احکام ہیں اور انھیں احکام کی وجہ سے غیر مسلم ممالک تین قسم کے دائرں پر تقسیم ہوتے ہیں۔

اہلِ مرنج و مرنجان :

ایک قسم اُن غیر مسلموں کی ہے جن کے ساتھ مسلمانوں کا نہ کوئی معاہدہ ہے اور نہ جنگ۔ یہ لوگ مرنج و مرنجان قسم کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات نہیں ہیں تو یہ ان کے درپئے آزار بھی نہیں ہیں۔ یہ نہ خود ستاتے ہیں

اور نہ مسلمانوں کے خلاف کسی سازش میں شریک ہیں۔ مسلمانوں کو صاف حکم ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور لطف وکرم کا معاملہ کریں۔ ارشاد ہے:

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ ط اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝[1]	اے مسلمانو! جن لوگوں نے مذہب کی بنیاد پر تم سے جنگ نہیں کی اور تم کو ترکِ وطن پر مجبور نہیں کیا اللہ تعالیٰ تم کو اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ایسے لوگوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا برتاؤ کرو، بے شبہ اللہ تعالےٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

جو حضرات قرآن کے اسلوبِ کلام کا ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس آیت میں اگرچہ لفظ "لا ینھاکم" کے ہیں جس سے محض اباحت اور اجازت کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے لیکن درحقیقت مراد وجوب ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ایک دو نہیں متعدد مواقع پر "لاجناح" بولا گیا ہے اور وجوب مراد ہے۔ یہی مضمون ایک دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے:

فَاِنِ اعْتَزَلُوْکُمْ فَلَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ وَاَلْقَوْا اِلَیْکُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ عَلَیْھِمْ سَبِیْلًا ۝[2]	پھر اگر وہ لوگ تم سے دوچار نہ ہوں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کے خواہاں ہوں تو خدا تم کو ان پر تدرجانے کی اجازت نہیں دے گا۔

اربابِ عہد وصلح:

دوسری قسم اُن غیر مسلموں کی ہے جن سے مسلمانوں کا عہد وپیمان ہے، اس سلسلہ میں اسلام کے احکام بالکل صاف وصریح یہ ہیں کہ مسلمانوں کو عہد وپیمان کی پابندی صورت اور معنیٰ دونوں کے اعتبار سے کرنی چاہیے، عہد شکنی، غدر، خیانت اور فریب دینا

---

[1] سورۂ ممتحنہ، آیت ۸۔ [2] سورہ نساء، آیت ۹۰

پرلے درجے کے معاصی کبیرہ میں سے ہے بلکہ یہاں تک حکم ہے کہ اگر مسلمانوں کو کن پھن بھی اس بات کی پہونچے کہ غیر مسلم دھوکا دینے کا ارادہ کر رہے ہیں تو اُس وقت بھی وہ اللہ پر بھروسہ کریں۔ اور اپنی طرف سے پہل اُس وقت تک نہ کریں جب تک وہم وظن یقین سے نہ بدل جائے۔

چنانچہ ارشاد ہوا:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ط [1]	اور اگر وہ لوگ تم سے صلح کرنے پر آمادہ ہوں تو (اے محمد) آپ اُن سے صلح کر لیجیے اور اللہ تعالےٰ پر بھروسہ رکھیے، بے شبہ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ آپ کو دھوکا دینے کا ارادہ کریں تو (آپ پروا نہ کریں) بس اللہ آپ کےلیے کافی ہے۔

ایک اور آیت میں فرمایا گیا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ط كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ [2]	اور جو شخص تم سے سلامتی اور صلح کی درخواست کرتا ہے اُس سے تم یہ نہ کہو کہ تو ایمان دار نہیں ہے، تم اس دنیا کے ساز و سامان کی طلب کرتے ہو دراں حالیکہ اللہ کے پاس بڑی بڑی نعمتیں ہیں تم (اسلام سے پہلے) ایسے ہی (دنیا پرست) تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جو عہد و پیمان ہوتا ہے، خدا نے اُس کو خود اپنا عہد کہا ہے، اور اس بنا پر اُس پر ثابت قدم رہنے کی سخت تاکید کی ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ	اور جب تم معاہدہ کرو تو اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو، اور قسموں کو موکد کرنے کے بعد اُن کو

---

[1] سورہ الانفال۔ رکوع ۸۔ آیت ۶۱ - ۶۲ [2] النساء رکوع ۱۳۔

بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ	نہ توڑو، درآں حالیکہ تم نے اپنے اوپر اللہ کو کفیل
اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ط اِنَّ	بنا لیا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ بے شک اللہ
اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ وَلَا	اس کو جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور اُس عورت
تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ	کی طرح مت بنو جو اپنا سوت کاتنے کے بعد
غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ	ٹکڑے ٹکڑے کر کے توڑ دے کر لگو تم اپنی
اَنْكَاثًا ط تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ	قسموں کو اس وجہ سے فساد کا سبب بنانے
دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ	کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادہ
اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ط[۱]	طاقت ور رہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی کا حکم اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اگر ان غیر مسلموں کے خلاف کچھ مسلمان بھی مدد طلب کریں تو حکم ہے کہ ان کی مدد نہیں کرنی چاہیے:

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي	اور اگر وہ (مسلمان) دین کے معاملہ میں تم سے مدد
الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ	کے طالب ہوں تو تم پر اُن کی مدد کرنا واجب ہے۔
اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ	البتہ ہاں اُس قوم کے خلاف نہیں جن میں اور تم میں
مِّيْثَاقٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	عہد و پیمان ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال
بَصِيْرٌ ۝ الانفال: ۷۲	کو دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں اگرچہ لفظ "قوم" کا ہے جس کا اطلاق مسلم اور غیر مسلم دونوں پر ہو سکتا ہے، لیکن "فی الدین" اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں قوم سے مراد غیر مسلم ہی ہیں، کیوں کہ مسلمان دین کے معاملہ میں جس مدد کے خواہاں ہیں وہ غیر مسلموں کے ہی خلاف ہو سکتی ہے۔

---

[۱] النحل۔ ۹۱۔ ۹۲۔ عہدِ جاہلیت میں قریش کا طریقہ یہ تھا کہ جس قبیلہ کو زیادہ طاقت ور پایا اس سے معاہدہ کر لیا اور پھر اگر اس سے بھی زیادہ طاقت ور کوئی اور قبیلہ ملا تو اس سے عہد و پیمان کر لیا اور پہلا معاہدہ توڑ دیا، اس آیت میں اس طریقہ کی مذمت اور معاہدہ کی پابندی کی تاکید کی گئی ہے۔

ایک اور آیت میں خاص مشرکین سے معاہدہ کا تذکرہ ہے :

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ [1]

مگر ہاں جن مشرکین کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا ہے، پھر ان لوگوں نے تمہارا کوئی حق کم نہیں کیا ہے، اور تمہارے برخلاف کسی کی مدد بھی نہیں کی ہے تو (اے مسلمانو) تم اس معاہدہ کی مدت تک اس کو پورا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

مندرجۂ بالا اور ان کے علاوہ دوسری آیات میں مسلمانوں کو معاہدہ کی پابندی کا حکم جس تاکید اور قوت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس پر کس طرح عمل کیا ؟ اس کا اندازہ صلح حدیبیہ کے اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ابھی صلحنامہ لکھا ہی جا رہا تھا کہ قریش کے نمائندہ سہل بن عمرو کا بیٹا ابو جندل زنجیروں میں گھسٹتا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور آپ سے مدد طلب کی، لیکن چونکہ صلحنامہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ مکہ سے اگر کوئی مسلمان بھاگ کر اِدھر آئے گا تو حضورؐ کے لیے اُس کو واپس کر دینا ضروری ہو گا۔ اس بنا پر اگرچہ حضرت عمرؓ جیسے مسلمانوں کو ناگواری ہوئی لیکن حضورؐ نے اس کی ذرا پروا نہ کی اور صلحنامہ کی دفعہ متعلقہ کے مطابق ابو جندل کو اسی حالت میں مکہ واپس کر دیا [2]

اس موقع پر یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ معاہدہ میں فریقین کے پلڑے کا برابر ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کا پلڑا کبھی کمزور بھی ہو سکتا ہے اور کبھی بھاری بھی، اوّل کی مثال یہی صلح حدیبیہ ہے جس کا رنج صحابہ کو عموماً اور حضرت عمرؓ کو خصوصاً اس درجہ تھا کہ اس تاثر کے ماتحت آپ کی زبان سے چند الفاظ جو بے ساختہ نکل گئے تھے اُن کا افسوس عمر بھر رہا۔ اس سلسلہ میں صلح حدیبیہ کا ہی یہ واقعہ

---

[1] التوبہ : ۴ [2] صحیح بخاری۔

بھی قابلِ ذکر ہے کہ ابو رافع ایک قبطی تھے، قریش نے گفت و شنید کے لیے ان کو بھی بھیجا تھا۔ خود ان کا بیان ہے کہ اب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو مجھے اسلام کی طرف رغبت محسوس ہوئی اور میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اب میں ہرگز قریش کی طرف واپس نہ جاؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا:

انی لا اخیس بالعھد والا	میں تو نہ عہد شکنی کرتا ہوں اور نہ قاصد کو قید کرتا
احبس البرید ولکن ارجع	ہوں، اس لیے اب تم بہرحال واپس جاؤ پھر جو
فان کان فی نفسک الذی	چیز اس وقت تمہارے دل میں ہے وہ اگر لوٹنے
فی نفسک الآن فارجع۔	کے بعد بھی ہو تو واپس آ جانا۔

اس ارشاد کے مطابق میں واپس چلا گیا اور اس کے بعد جب موقع ملا خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا[1]۔

اور دوسری صورت کی مثال وہ مصالحت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہود اور نجران کے عیسائیوں کے ساتھ کی تھی۔ بہرحال مسلمانوں کی پوزیشن کچھ ہی ہو، قرآن کا حکم یہ ہے کہ جب معاہدہ ہے تو اس کی پابندی مکمل طور پر اور ایمانداری سے ہونی چاہیے۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ	اور اپنا عہد و پیمان پورا کرو (قیامت کے دن)
كَانَ مَسْـُٔوْلًا (بنی اسرائیل رکوع ۴)	اس کے بارہ میں پوچھ گچھ ہوگی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام نے ان احکام کی پابندی اس طرح کی کہ

امیر معاویہ اور اہلِ روم کے درمیان ایک معاہدہ تھا جو میعادی تھا، جب اس معاہدہ کی مدت ختم ہونے کے قریب آئی تو امیر معاویہ ایک لشکرِ جرار لے کر اس ارادہ سے روانہ ہوئے کہ معاہدہ کے ختم ہوتے ہی دھاوا بول دیں گے، ابھی یہ لشکر راستہ میں تھا کہ ایک صحابی جن کا نام عمرو بن عبسہ تھا اچانک سامنے کی طرف سے بھاگتے ہوئے یہاں پہنچے

---

[1] سنن ابی داؤد جلد دوم کتاب الجہاد۔ حدیث نمبر ۱۸ا۲

اور امیر معاویہ سے بولے "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جن لوگوں کا کسی قوم سے عہد ہو تو وہ اُس کو اُس وقت تک فسخ نہ کریں جب تک معاہدہ کی مدت نہ گزر جائے یا دونوں اُس کو برابر سرابر فسخ کرنے پر رضامند نہ ہو جائیں" راوی کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی امیر معاویہ نے حملہ کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں سے واپس ہو گئے۔

(سنن ابی داؤد کتاب الجہاد حدیث نمبر ۲۱۹م و ترمذی جلد اول)

دشمنانِ جنگجو:

تیسری قسم اُس غیر مسلم ملک یا قوم و قبیلہ کی ہے جو نہ غیر جانبدار ہیں۔ اور نہ اُن سے مسلمانوں کا کوئی عہد و پیمان ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے درپئے آزار رہتے ہیں، اُن کے خلاف سازشیں کرتے اور گھر سے بے گھر کرتے ہیں، یہ لوگ قرآن کی اصطلاح میں "اربابِ اعتدا" ہیں۔ اعتدا دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک بالقوۃ اور دوسرا بالفعل، اگر اعتدا بالقوہ ہو یعنی اگرچہ مسلمانوں پر ابھی تک کوئی حملہ نہیں ہوا ہے، لیکن ناقابلِ تردید ذرائع سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں تو قرآن میں حکم یہ ہے کہ اس کے جواب میں مسلمان بھی غافل نہ رہیں بلکہ پوری مستعدی اور بیدار مغزی کے ساتھ عصری آلاتِ حرب فراہم کرنے کی حسبِ استطاعت تیاری کریں۔ ارشاد ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔ (الانفال ۶۰)	اور مہیا کرو اُن سے جنگ کرنے کے لیے وہ سب کچھ طاقت اور گھوڑے جو تمہارے امکان میں ہو، تاکہ تم ان کے ذریعہ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کرو۔

یہی وہ دشمن ہیں جن کی نسبت ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً	جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ اسے پسند کرتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور ساز و سامان سے غافل ہو تو یہ لوگ تم پر اچانک

وَّاحِدَةً۔ (النساء ۱۰۲) حملہ کر دیں۔

اسی سلسلہ میں یہ آیت بھی ہے جس میں ارشاد ہوا :

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ	بے شبہ ہم نے اپنے پیغمبر کھلی ہوئی نشانیوں
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَ	کے ساتھ بھیجے ہیں اور اُن کے ساتھ کتاب
الْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ	اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف
بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ	قائم کریں اور ہم نے لوہا اتارا ہے جس میں
فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَّمَنَافِعُ	سخت رعب داب ہے۔ اور لوگوں کے لیے
لِلنَّاسِ۔ (الحدید ۲۰)	منافع ہیں۔

یہ سب کچھ اعتدا بالقوۃ کے سلسلہ میں تھا! اب رہی اعتدا کی دوسری قسم بالفعل یعنی مسلمانوں پر سچ مچ دھاوا بول دیا گیا، اور اُن کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا گیا ہے تو اب قرآن کا حکم یہ ہے کہ تم ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرو، اور ان کو شکست دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرو، یہی وہ دشمنانِ جنگجو ہیں جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے :

اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ	جن لوگوں نے (اے مسلمانو) تم سے دین
الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ	کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تم کو تمہارے
وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ	گھروں سے نکالا ہے اور تم کو گھروں سے نکالنے
وَظَاهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ	پر تمہارے دشمنوں کی مدد کی ہے اللہ تم کو ایسے
اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ	لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے سختی کے ساتھ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔	منع کرتا ہے۔ اور جو ان کے ساتھ دوستی
(الممتحنہ ۹)	کرے گا دراصل ظالم وہی ہوگا۔

اسلام اور مسلمانوں کے یہی وہ دشمن اور حریفانِ نافرجام ہیں جن سے جنگ کرنے پر قرآن کی متعدد آیات میں مسلمانوں کو برانگیختہ کیا گیا ہے : ایک آیت میں فرمایا گیا :

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ (نساء۔ رکوع ۱۰)	اے مسلمانو! تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے اللہ کے لیے اور اُن کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہم کو اس آبادی سے نکال جس کے لوگ ظالم ہیں۔

علاوہ ازیں قوم شمویل سے نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا:

قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاءِنَا۔ (البقرہ۔ رکوع ۳۲)	ان لوگوں نے (اپنے نبی سے کہا) "ہم خدا کی راہ میں کیوں نہ لڑیں گے جب کہ ہم اپنے گھروں اور اولادوں سے جدا کیے گئے ہیں۔

حرب و قتال کے سلسلہ میں یہ وہ آیات ہیں جو محرکات و بواعث جنگ کو متعین کرتی ہیں، ان سب کا خلاصہ اس آیت میں بیان کر دیا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ۔ (النساء آیت ۷۶)	جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کے راستہ میں قتال کرتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ شیطان کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں۔

یہ اللہ کا راستہ (سبیل اللہ) کیا ہے؟ قرآن نے اس کو مبہم نہیں رکھا۔ یہ نیکی اور احسان ضعیفوں اور کمزوروں کی مدد، دفع شر، رفع جور و ظلم، استیصال فتنہ و فساد، اور اقامت امن و امان کی راہ ہے۔ اب جنگ چھڑ جائے تو حکم ہے کہ مسلمان بہادروں کی طرح لڑیں اور اس وقت تک نچلے نہ بیٹھیں جب تک شر و فساد کے بچھو کا ڈنک نہ مارا جائے، اس سلسلہ میں اس نوع کی آیات ہیں:

(۱) وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۔ (الانفال - رکوع ۵)	اور تم ان لوگوں سے اُس وقت تک جنگ کرو جب تک کہ فتنہ ختم اور دین کل کا کل اللہ کے لیے نہ ہو جائے ۔
(۲) اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۔ (الانفال - رکوع ۱۰)	اگر تم ایسا (یعنی جنگ) نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور عظیم فساد ہوگا !

سطورِ بالا میں جو آیات نقل کی گئی ہیں اُن کو پیشِ نظر رکھ کر غور کیجیے کہ ایک ملک کے دوسرے ملک کے ساتھ اور ایک قوم کے دوسری قوم کے ساتھ جو تعلقات ہوتے ہیں وہ تین قسم کے ہی ہوتے ہیں :

(الف) غیر جانبداری اور ناطرفداری (neutrality) کے ۔ قرآن نے اس کو "اعتزال" کہا ہے ۔

(ب) عہد و پیمان اور مصالحت و موادعت (Treaty or alliance) کے ۔

(ج) حرب و ضرب اور بغض و عداوت (War, Hostility) کے ۔

یہ تینوں حالتیں اور تعلقات کی یہ نوعیتیں مستقل بالذات ہیں ، ایک دوسرے کے تابع اور اُس کی قسم نہیں ، پس اب لامحالہ اقوامِ غیر کے دار بھی تین قسم کے ہوں گے اور یہ تینوں مستقل بالذات ہوں گے ، اور ان کی ترتیب یہ ہوگی :

(الف) دارالامن (ب) دارالعہد (ج) دارالحرب ۔ اب اگر مسلمانوں کے ملک کو جسے دارالاسلام کہا جاتا ہے شامل کر لیا جائے تو دار کی قسمیں دو یا تین نہیں بلکہ جیسا کہ ہم اس بحث کے شروع میں بتا چکے ہیں ، چار ہوں گی ۔[1]

---

[1] افسوس ہے ہمارے مفسرین کرام کے ایک طبقہ نے ان آیات کو باہم ایک دوسرے سے ٹکرا دیا ہے اور اس بنا پر ان کو ان میں نسخ کا قائل ہونا پڑا ہے ، چنانچہ کہتے ہیں کہ آیاتِ قتال آیاتِ صلح و موادعت کے لیے ناسخ ہیں ۔ انھیں مفسرین کے زیرِ اثر وہ فقہائے کرام ہیں جو اصل دار دو قسم کے ہی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۸)

دار الحرب میں سکونت جائز نہیں :

علاوہ ازیں اس تقریر سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جب دار الحرب کہتے ہی اُس ملک کو ہیں جس کی حکومت اسلام اور مسلمانوں کی دشمن ہو، مسلمانوں پر ظلم و تعدی کرتی ہو اور اس بنا پر نہ دونوں میں جنگ بالفعل ہو یا جنگ کے سے حالات قائم ہوں تو اب مسلمانوں کے لیے اس ملک میں سکونت رکھنا جائز نہیں ہوگا، بلکہ جیسا مولانا نانوتوی نے لکھا ہے (حوالہ گزر چکا) وہاں سے ہجرت واجب ہوگی، چنانچہ قرآن مجید کی آیتِ ذیل ایسے ہی مسلمانوں کے بارہ میں ہے جو دار الحرب سے ہجرت نہیں کرتے :

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ	جن لوگوں نے ہجرت نہ کرکے اپنے اوپر ظلم کیا
ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ	ہے جب ان کو موت آئے گی تو فرشتے ان سے
كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ	کہیں گے "تمہیں کیا ہو گیا تھا" (جو ہجرت
فِی الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ	نہیں کی تھی) یہ کہیں گے "ہم ملک میں کمزور
اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا	تھے" اب فرشتے کہیں گے "کیا اللہ کی زمین
فِیْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ	وسیع نہیں تھی جو تم اُس میں ہجرت کرتے ؟
جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۝	پس یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور
(النساء - رکوع ۱۴)	وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

ہجرت کے وجوب حکم سے اگر مستثنیٰ ہیں تو صرف وہ لوگ جو بے کس و بے بس ہیں اور نقل مکانی کی استطاعت ہی نہیں رکھتے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا گیا :

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ	مگر ہاں وہ کمزور مرد، عورتیں اور بچے
الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ	جو کوئی تدبیر نہیں کرسکتے" اور جنھیں کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دو قسم کے ہی مانتے ہیں، دار الاسلام اور دار الحرب اور پھر امن وامان یا عہد و پیمان کی کوئی صورت پیش آجاتی ہے تو اس کو دار الحرب کی ہی ایک قسم قرار دیتے ہیں لیکن ہم نے جو تقریر کی ہے اس کی روشنی میں تمام آیات اپنی اپنی جگہ قائم رہتی ہیں! ور احکام میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے، اور یہی ان آیات کا منشا ہے۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ (النساء رکوع ۱۴)	راستہ ہی نہیں ملتا تو یہ وہ لوگ ہیں کہ خدا ممکن ہے انھیں معاف کر دے، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا، اور بخشنے والا ہے۔

ایک لطیفہ :

مولانا محمد میاں سابق ناظم جمعیۃ علمائے ہند جو دار الحرب سے ہجرت کو واجب قرار نہیں دیتے انھوں نے ایک عجب کمال کیا ہے ۔ قرآن میں ایک آیت ہے جس میں دار الحرب سے ہجرت نہ کرنے والوں کے خلاف اظہارِ بیزاری و ناراضگی کیا گیا اور بطور خفگی کے دار الاسلام کے مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ اچھا! اگر یہ لوگ ہجرت نہیں کرتے تو نہ کریں، یہ جانیں اور ان کا کام! اب اگر (دار الحرب میں رہنے کے باعث) ان کو کچھ نقصان بھی پہونچے تو اے دار الاسلام کے مسلمانو! تم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے[1] مولانا نے اس سے عدم وجوبِ ہجرت پر استدلال کیا ہے[2] ذرا غور کیجیے تو یہ استدلال بچ مچ ایسا ہی ہے جیسے "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" اور فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ؕ سے یہ ثابت کرنا کہ قرآن دین کے معاملہ میں، ہر شخص کو اختیار دیتا ہے کہ وہ جو دین چاہے اختیار کرے۔

بہرحال قرآن سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ذی استطاعت مسلمانوں کے لیے دار الحرب میں سکونت اختیار کرنا حرام ہے، اور جو ایسا نہیں کرتے ان کے لیے جہنم کی وعید شدید ہے۔ البتہ اس کے علاوہ جو اور دو دار ہیں :۔ یعنی دار الامان اور دار العہد اُن میں رہنا بسنا اور توطن جائز ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ :

یہاں ایک اشکال واقع ہوتا ہے، اُس کا دفع کرنا بھی ضروری ہے۔ اشکال یہ ہے کہ

---

[1] وہ آیت یہ ہے :۔ "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا" (الانفال، رکوع ۱۰) [2] روزنامہ الجمعیۃ دہلی مورخہ ۷ رمئی ۱۹۶۶ء صفحہ ۴ کالم ۲-۱

جب قرآن سے چار قسم کے دار ثابت ہوتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ کتبِ فقہ میں عام طور پر دارالاسلام اور دارالحرب صرف ان ہی دو داروں کا ذکر ملتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اگرچہ مشہور یہ دو دار ہی ہیں لیکن امام شافعی اور امام محمد بن الحسن ایک تیسرا دار بھی مانتے تھے، چنانچہ السیر الکبیر میں امام محمد نے اس کا تذکرہ کرکے اسے دار موادعت بھی کہا ہے اور دار العہد بھی، شیخ ابوزہرہ اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ہمارے لیے یہ کہنا بالکل ممکن ہے کہ دار العہد دارِ حرب نہیں ہوتا۔ اور اگرچہ اس پر بعض احکام دارالاسلام کے بھی جاری ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ایک مستقل بالذات دار ہوتا ہے"[1]

لیکن یہ جواب رفع اشکال کے لیے کافی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے، جیساکہ شیخ محمد ابوزہرہ نے لکھا ہے:

"جو زمانہ اجتہاد اور فقہ کی تدوین و ترتیب کا تھا اُس میں صورتِ حال یہ تھی کہ عملاً تین قسم کے ہی دار تھے۔ ایک دارالاسلام، دوسرا دارالحرب اور تیسرا دارالعہد، چوتھا دار یعنی اُن لوگوں کا ملک جو ناطرفدار اور غیر جانب دار ہوں وہ ناپید تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانہ میں جو غیر مسلم حکومتیں مسلمانوں کے اطراف و اکناف میں تھیں، ان کی ریشہ دوانیوں کے باعث مسلمان اُن کی طرف سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے اس بنا پر مسلمان ان حکومتوں سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ اس کے ساتھ عہد و پیمانِ امن کریں، اور اگر انھیں یہ منظور نہیں ہے تو اب اُن کے لیے اسلام یا جنگ، یہ صرف دو راہیں کھلی ہوئی ہیں جس کو چاہیں اختیار کرلیں"[2]

یہی بات عہدِ حاضر کے نامور عالم اور محقق شیخ عبدالقادر عودہ نے کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] مقالہ العلاقات الدولیۃ فی الاسلام مطبوعۂ الازہر بابت مارچ ۱۹۶۳ء ص ۲۸۰۔

[2] ایضاً ص ۲۷۶۔

"اسلامی نظریات جو تمام بلادِ اجنبیہ کو ایک دارِ حرب قرار دیتے ہیں۔ باوجودیکہ ان کی حکومتیں مختلف ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان، ترکستان، روس، ہند۔ اسپین۔ فرانس اور روم ان سب ملکوں کی حکومتوں سے جنگ کر رہے تھے۔ اس بنا پر وہ ان سب ملکوں کو اور ان کے علاوہ دوسرے ملکوں کو بھی دارِ حرب کہنے لگے۔"[۱]

اس بنا پر ہمارے علماء کو یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ عہدِ بنی عباس کے اوائل میں فقہائے کرام نے دار کی جو تقسیم کی اور اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ اُس زمانہ کے مخصوص وقتی اور مقامی حالات کا نتیجہ ہے جب کہ جنگ کی بنیادی وجہ مذہب ہوتا تھا اور اسی بنیاد پر مسلمان ایک عالمگیر جنگ سے دوچار تھے۔ یہ حالات کا دباؤ کس قدر شدید ہوتا اور فکر ونظر کے سانچے اور پیمانے کس طرح بدل دیتا ہے؟ اس کی ایک دل چسپ مثال ملاحظہ فرمائیے:

حالات کے دباؤ کی ایک عجیب مثال:

صلح حدیبیہ کے ذکر کے سلسلہ میں آپ اوپر ابورافع قبطی کا واقعہ پڑھ آئے ہیں کہ یہ قریش کی طرف سے سفیر بن کر آئے تھے، لیکن حضورِ انورؐ کو دیکھتے ہی انھوں نے اسلام کو قبول کرنا چاہا، اور عرض کیا کہ اب میں قریش کی طرف واپس نہیں جاؤں گا۔ لیکن حضورؐ نے ان کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی۔ انھیں واپس کر دیا اور فرمایا "میں نہ بدعہدی کرتا ہوں اور نہ قاصدوں کو حبس کرتا ہوں" اس واقعہ کو اور اس کے ساتھ ہی قرآن مجید میں وفائے عہد کے جو احکام بڑی تاکید کے ساتھ ہیں ان سب کو سامنے رکھ کر سوچیے کہ اس طرح کا معاملہ جب کبھی پیش آئے تو اس وقت اسلامی حکومت کا عمل کیا ہونا چاہیے؟ حضورؐ چونکہ ہر معاملہ میں ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہیں اس بناء پر یقیناً اسلامی حکومت کو وہی کرنا چاہیے جو اس واقعہ میں آپؐ نے کیا۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ امام ابوداؤدؒ اپنی سنن میں اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

---

[۱] التشریع الجنائی الاسلامی جلد اول ص ۲۹۱۔

هذا كان فى ذالك الزمان واليوم لا يصلح — یہ اُس زمانہ میں تھا مگر آج یہ مناسب نہیں ہے۔

اس عبارت کا مطلب کیا ہے؟ اسے شارح سنن ابی داؤد کی زبان سے سنیے۔ فرماتے ہیں:

والمراد بهذا الكلام ان من جاء من الكفار الى الامام رسولاً فاسلم واراد ان لا يرجع الى الكفار لا يرده الامام اليهم۔ واما ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يحبس ابا رافع وهو من المخصوص به صلى الله عليه وسلم۔[1]

اور اس کلام سے مراد یہ ہے کہ کفار کی طرف سے اگر کوئی شخص امام کے پاس سفیر بن کر آئے اور مسلمان ہو جائے اور واپس نہ جانے کا ارادہ کرے تو امام اس کو واپس نہ کرے۔ اب رہی یہ بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو رافع کو نہیں روکا تھا تو یہ اُن چیزوں میں سے ہے جو آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہیں۔

حقیقت یہ ہے۔ جیسا کہ میں نے مکگل یونیورسٹی میں ایک لکچر میں کہا تھا۔ تاریخ مذاہب عالم کا یہ بڑا دردانگیز سانحہ ہے کہ مذہب جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے ماننے والوں کو ایک خاص تربیت دے کر ایک سوسائٹی پیدا کرتا ہے، یہ سوسائٹی ایک تاریخ پیدا کرتی ہے، لیکن دو تین نسلوں کے بعد تاریخ مذہب کی جگہ لے لیتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب اپنی اصلی شکل و صورت میں نظر انداز ہو جاتا ہے اور پھر جتنے فیصلے ہوتے ہیں، وہ سب تاریخ کی روشنی میں ہوتے ہیں، چنانچہ اسلام کے ساتھ بھی معاملہ یہی پیش آیا۔ علم الکلام۔ فقہ۔ تصوف، اور تاویل یہ وہ چیزیں ہیں جن کو تاریخ نے پیدا کیا ہے لیکن یہ ہی چیزیں ہمارے فکر و نظر کا معیار بن گئی ہیں، اور قرآن و سنت جو مذہب کے اصل سرچشمے ہیں اُن کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے: یعنی اگر آپ مثلاً حنفی ہیں تو وہی کہیں گے جو فقہائے احناف نے کہا ہے اور پھر قرآن و سنت سے اس کے

---

[1] بذل المجهود، جلد ۴، ص ۵۶، مطبوعہ جید برقی پریس (دہلی)

لیے ثبوت فراہم کریں گے، حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ پہلے آپ براہِ راست مخلّی بالطبع ہو کر قرآن وسنت کی روشنی میں غور کریں اور اس کے بعد فقہا کے اقوال کا جائزہ لیں۔

بہر حال اب جبکہ یہ ثابت ہوگیا کہ دار ازروئے قرآن دو یا تین نہیں بلکہ چار ہیں اور ہر دار کسی کی قسم نہیں بلکہ مستقل بالذات ہے اور ان کے احکام الگ الگ ہیں تو اب موقع ہے کہ اصل سوال کا جواب دیا جائے۔ یعنی یہ کہ اچھا! جب ہندوستان دارالحرب نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ہندوستان جس طرح دارالحرب نہیں ہے۔ دارالاسلام بھی نہیں ہے اور دارالعہد اور دارالامن بھی نہیں ہے۔ کیوں؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے کہ جب ہم ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک اس ملک کی شرعی حیثیت مسلمان ملکوں اور حکومتوں کے لیے اور دوسرے خود اس ملک کے مسلمانوں کے لیے، جہاں تک امرِ اوّل کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت مسلمان ملکوں اور حکومتوں کے لیے "دارالعہد" کی ہے، پھر یہ عہد اور مختلف معاملات و مسائل میں اشتراک و تعاون جتنا زیادہ ہوگا اُسی قدر ایک مسلمان ملک کا تعلق ہندوستان کے ساتھ زیادہ ہوگا۔ مثلاً ایک ملک کے ساتھ وہ برطانوی کامن ولتھ میں بھی شریک ہے اور مجلسِ اقوامِ متحدہ میں بھی! اور ایک ملک کے ساتھ یہ دونوں رشتے بھی ہیں اور اُن کے علاوہ کچھ اور تجارتی، اقتصادی اور ثقافتی علائق و روابط بھی ہیں، ظاہر ہے ان دونوں قسم کے ملکوں کے ساتھ "دارالعہد" ہونے کا رشتہ ایک ہی درجہ اور مرتبہ کا نہیں ہو سکتا، بہرحال جس مسلمان ملک کے لیے ہندوستان جس درجہ کا دارالعہد ہے اُس ملک کی حکومت کا مذہبی فرض ہے کہ وہ اُس کا احترام کرے اور عہد و پیمان کے جملہ شرائط کو صورۃً و معنیً پورا کرے[1]!

---

[1] فقہ کی کتابوں میں ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم ملک کسی مسلمان ملک کے ساتھ روپیہ میں دس آنہ احسان و کرم اور لطف و مدارات کا معاملہ کرے تو مسلمان ملک کا فرض ہے کہ اس کے جواب میں وہ غیر مسلم (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ)

اب رہا خود ہندوستان کے مسلمانوں کا معاملہ! تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ ملک دار کی چاروں قسموں میں سے کوئی قسم نہیں ہے۔ دارالحرب نہ ہونے پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے، رہے باقی تین دار! تو اس کا دارالاسلام نہ ہونا ایسا ظاہر ہے کہ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس ملک کی حکومت ہی سیکولر اور لادینی ہو اُس کے دارالاسلام ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے! اگرچہ ہمارے جن علما نے انگریزوں کے زمانہ کے ہندوستان کو — انگریزی حکومت کے سیکولر ہونے کے باوجود — دارالاسلام کہا ہے۔ وہ موجودہ آزاد ہندوستان کو بدرجۂ اولیٰ دارالاسلام کہیں گے۔ لیکن ہم ابھی آگے چل کر بتائیں گے کہ اُن کا وہ فیصلہ غلط تھا اور یہ بھی غلط ہوگا۔ کیوں کہ درحقیقت ان حضرات کا تصورِ دارالحرب و دارالاسلام ہی صحیح نہیں۔

جس طرح ہندوستان دارالحرب اور دارالاسلام نہیں ہے۔ اسی طرح دارالعہد اور دارالامان بھی نہیں۔ اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں دار وہاں پائے جاتے ہیں جہاں مسلمان ایک فریق ہوں اور غیر مسلم فریق ثانی ہوں۔ اور ان دونوں میں علی الترتیب معاہد اور آمن و مستامن ہونے کا رشتہ اور تعلق پایا جائے۔ اور ظاہر ہے یہاں یہ رشتہ مفقود ہے۔ کیونکہ دستوری طور پر اور قومیت (nationality) کے موجودہ بین الاقوامی تصور کے ماتحت اس ملک کے مسلم اور غیر مسلم سب مل ملا کر ایک قوم ہیں۔ اور حکومت جو ہے وہ اسی قوم کی ہے۔ اور یہ قوم ایک دستور کی پابند ہے۔ جس کو عملی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ملک کے ساتھ بدرجہ ۱۲ ریا ۱۴ رمعاملہ حسن اخلاق کا کرے۔ اور فقہا اس کی دلیل میں فرماتے ہیں :۔ "لاننا احق بالمکارم والاخلاق" یعنی بحیثیتِ مسلمان کے ہم کو اور زیادہ بہتر مکارم واخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں اگر بالفرض ایک مسلمان بھی نہ ہوتا تو یہ ملک مسلم ممالک کے لیے انٹرنیشنل ڈپلومیٹک اصول وضوابط کے ماتحت پھر بھی دار العہد ہوتا۔ لیکن جب کہ یہاں پانچ ساڑھے پانچ کروڑ مسلمان بھی آباد ہیں، اور ان کی عظیم الشان روایات اور تاریخ ہیں تو اب مسلم ملکوں کے لیے اس ملک کے ساتھ خیر سگالی اور دوستی کا برتاؤ کرنے کی ایک مزید وجہ وجیہ موجود ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی دونوں سے بجتی ہے۔

شکل دینا اور اُس کی حفاظت کرنا حکومت کا فرض ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کو جو حقوق حاصل ہیں وہ دستور نے دیے ہیں نہ کہ اکثریت نے اور انھیں جو کچھ شکایت کسی معاملہ میں بھی ہو حکومت سے ہی ہو سکتی ہے جس کی تشکیل میں خود مسلمانوں کا ایسا ہی حصہ ہے جیسا دوسروں کا۔ کہ وہ دستور کی حفاظت اور دوسرے لفظوں میں ان کی نمایندگی اور اعتماد کا حق ادا نہیں کر رہی ہے، بہر حال ان وجوہ سے ہندوستان یہاں کے مسلمانوں کے لیے دار العہد اور دار الامن بھی نہیں ہے۔

اب پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ بھی نہیں اور وہ بھی نہیں تو آخر یہ ہے کیا؟ اور شرعی طور پر اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں یہ ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ پہلے زمانہ میں ایک ملک میں رہنے والے مختلف مذہبی طبقات کے باہمی تعلقات اور بین الاقوامی علائق و روابط جس نہج اور جس ڈھنگ پر ہوتے تھے، آج صورتِ حال اُس سے بالکل مختلف ہے اس بنا پر پہلے قوموں کی جو تقسیم ہوتی اور اس پر جو احکام و مسائل مرتب ہوتے تھے آج اُن کا اطلاق اُن قدیم مفاہیم و معانی کے ساتھ نہیں ہو سکتا، باب الرقیق اور باب العتق فقہ کے بہت اہم ابواب تھے۔ لیکن آج یہ بالکل بے کار ہیں۔ کتاب الحدود کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن آج کہاں اس پر عمل ہو رہا ہے؟ فقہ میں "ذمی" اور "ذمیہ" کے احکام و مسائل کا تذکرہ ملتا ہے لیکن آج ذمی کا وجود کس ملک میں ہے؟ یہاں اس سے بحث نہیں کہ کون سی تبدیلی صحیح ہے اور کونسی غلط؟ دیکھنا صرف یہ ہے کہ تبدیلی ہے یا نہیں؟ پس جب تبدیلی ہے تو لازمی طور پر اس کا اثر احکام و مسائل پر پڑے گا۔ فقہ کا مشہور اصول ہے کہ تبدیلِ مذہب سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب یہ بلاءِ عام ہو گئی تو مولانا تھانویؒ نے علماء کے مشورہ اور ان کے اتفاق سے فتویٰ اس کے برعکس دیا اور اس پر الحیلة الناجزة للمرأة العاجزة کے نام سے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا تعلیمِ قرآن و امامت کی اجرت کو فقہائے متقدمین نے ناجائز کہا ہے۔ لیکن متاخرین نے اِسے سندِ جواز عطا فرما دی۔ حلق لحیہ کو فقہائے متقدمین نے علامتِ فسق اور اُس کے مرتکب کو مردود الشهادة قرار دیا۔ لیکن آج ان لوگوں کی نہ صرف یہ کہ شہادت

مردود نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی ممالک میں امامت ۔ درسِ قرآن و حدیث اور عہدۂ قضا و افتا کی کرسیوں پر متمکن ہیں ۔ جن درختوں کے پھل ابھی پکے نہیں اور اُن کی مقدار معلوم و معین نہیں ہے، فرمانِ نبویؐ کے مطابق ان کی بیع حلال نہیں تھی، لیکن آج ہر جگہ یہ کاروبار ہو رہا ہے اور بڑے بڑے زمین دار علماء کر رہے ہیں اور کوئی پوچھتا تک نہیں ہے ۔ تصویر کھنچوانا اور رکھنا دونوں کو ممنوع قرار دیا گیا ۔ لیکن آج حجازِ مقدس میں بھی اس کا عام چلن اور رواج ہے ۔ فقہا اس بات میں اختلاف کرتے رہے کہ عورت کا چہرہ اور اُس کے دونوں ہاتھ بھی ستر میں داخل ہیں یا نہیں ۔ لیکن عورت نے پردہ کے پیچھے سے وہ جست لگائی کہ جھٹ ہر شعبۂ حیات میں مرد کی شریک و سہیم نہیں، بلکہ رقیب بن گئی ۔ اور اسلامی سماج نے اس کو اس خموشی سے قبول کر لیا ہے کہ دخترانِ اسلام گرمی کے موسم میں سمندروں کے کنارے غسلِ آفتابی لیتی ہیں اور کہیں پتّہ بھی نہیں کھڑکتا ! یہ سب کچھ کیا ہے ؟ اچھا یا بُرا ماحول کا انقلاب ہے، جس نے اسلام کی سماجی اور معاشرتی زندگی کی قدروں کو اتھل پتھل کر دیا اور انھیں کچھ سے کچھ بنا دیا ہے ۔ ان میں کتنی چیزیں ہیں جو پہلے ناجائز تھیں اور اب انھیں فتویٰ کے سہارے جائز کر دیا گیا ہے ، اور کتنی ہی وہ ہیں جو پہلے کی طرح ناجائز یا حرام اب بھی ہیں، لیکن ان سے متعلق بھی حالات کا یہ اثر ضرور ہوا ہے کہ پہلے یہ بالکل ناگوار تھیں اب گوارا ہو گئی ہیں۔ اب اگر ان چیزوں کے گوارا ہو جانے کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں ہے جب وقت کا مجدد اور مفتی انھیں بھی سندِ جواز عطا فرما کر محللات میں شامل کر لے گا اور دنیا اسے دیکھ کر شیخ سعدی کے مقولہ " زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز " کی حکمت و مصلحت پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے پر مجبور ہو گی ۔

بین الاقوامی تصورِ قومیت :

بہر حال جہاں تک مسئلہ زیرِ بحث کا تعلق ہے ۔ اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگرچہ اسلام میں شخصی یا خاندانی حکومت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ لیکن اس پر عمل صرف خلافتِ راشدہ کے زمانہ تک رہا ۔ اس کے بعد حکومت خلافت یا امامت سے ملوکیت کی شکل و صورت میں منتقل اور خاندانوں میں محدود ہو کر رہ گئی ۔ جس کا موقع لگا بادشاہ بن کر بیٹھ

گیا اور جب اُس کا انتقال ہوا تو تختِ شاہی بطور ایک ترکہ کے اُس کی آل اولاد یا بھائی بھتیجوں کے حصہ میں آگیا۔ اس دور میں شاہی خاندان کے علاوہ حدودِ مملکت میں رہنے والے جتنے لوگ ہوتے تھے رعیت یا رعایا (subject) کہلاتے تھے۔ لیکن خود رعیت دو حصوں میں تقسیم ہوتی تھی، ایک وہ لوگ جو حکمرانوں کے ہم مذہب ہوتے تھے اور دوسرے وہ جو ان کے ہم مذہب نہیں ہوتے تھے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ ملک کے شہری (citizens) ہوتے تھے۔ لیکن بنیادی حقوق میں یکساں شریک ہونے کے باوجود ان دونوں میں بعض اعتبارات سے فرق و امتیاز ہوتا تھا۔ مسلمان حکومتوں میں یہی فرق "ذمی" کے لفظ سے ظاہر کیا جاتا تھا۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیساکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں وہاں کے دستور میں انیسویں ترمیم سے پہلے عورتوں کو تمام حقوقِ شہریت حاصل تھے۔ لیکن ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ یا آج بھی امریکہ کے جو پیدائشی باشندے ہیں اور جو وہاں آکر آباد ہوگئے ہیں اُن میں فرق یہ ہے کہ دوسری قسم کے لوگ پریذیڈنٹ یا وائس پریذیڈنٹ نہیں ہوسکتے۔ حکومت ایک قسم کی مذہبی ہوتی یا سمجھی جاتی تھی۔ اس بنا پر اس مذہب کے لوگوں کو یک گونہ فوقیت ہوتی تھی۔ تمام دنیا میں یہی طریقہ رائج تھا!

لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ رعایا (subject) کی جگہ شہریت (citizenship) اور قومیت یا جنسیت (nationality) نے لے لی ہے اور حکومت کے تصور کے ساتھ ساتھ باشندگانِ ملک کی حیثیت کا تصور بھی بدل گیا ہے۔ پہلے حکومت چند افراد یا خاندان کی ہوتی تھی، اس بنا پر حکمراں آقا اور باشندگانِ ملک رعایا سمجھے جاتے تھے لیکن آج حکومت عوام کی نمایندہ اور اُن کی منتخب ہوتی ہے۔ اور قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں جو جاگیردارانہ نظامِ سلطنت (feudal system of government) رائج تھا) اب اس کے بجائے علاقائی خودمختاری (territorial state sovereignty) کا رواج ہے اور جسے ہم اسٹیٹ کہتے ہیں وہ سب اہلِ ملک کا ایک کارپوریشن (corporation of member individuals) ہے۔ یورپ

کا یہ تصورِ اسٹیٹ اور اُس کے نتیجہ میں شہریت اور قومیت کا یہ تصور اب عالمگیر اور بین الاقوامی ہے جسے مسلم اور غیر مسلم سب ممالک نے تسلیم کر لیا ہے ۔ اور پاسپورٹ اور ویزا اور شہریت و قومیت سے متعلق تمام بین الاقوامی مسائل و معاملات کا انتظام و انصرام اسی پر ہے ۔

دار الاسلام کی تعریف :

شہریت ۔ قومیت اور اسٹیٹ ان جدید مسلمہ بین الاقوامی تصورات کو ذہن میں رکھ کر اب اس پر غور کیجیے کہ آج صحیح معنیٰ میں دار الاسلام کس ملک کو کہا جا سکتا ہے ؟ فقہا کی تصریح کے مطابق دار الاسلام میں تین شرائط کا ہونا ضروری ہے ۔

(۱) صدرِ مملکت جسے فقہا عام طور پر امام کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اُس کو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے ناموسِ شریعت کا محافظ اور پاسبان ہونا چاہیے ۔

(۲) ملک میں اسلامی قانون رائج ہونا چاہیے جس کا بنیادی مقصد عدل اور احسان کا قیام اور فواحش و منکرات کا استیصال ہے ۔

(۳) ہر مسلمان خواہ کسی ملک اور علاقہ کا باشندہ ہو اور اس اعتبار سے ایک مقامی قومیت رکھتا ہو ، اُس کو دار الاسلام میں بلا روک ٹوک آنے کی اجازت ہو گی اور اسے وہاں پہونچتے ہی وہ تمام شہری حقوق حاصل ہو جائیں گے جو وہاں کے پہلے سے رہنے والوں کو حاصل ہیں ، وہ وہاں زمین خرید سکتا ہے ۔ کھیتی باڑی اور کاروبار کر سکتا ہے ۔ ملازمت میں لیا جا سکتا اور جاگیر جائداد پیدا کر سکتا ہے اسے اختیار ہے جب تک چاہے وہاں قیام کرے ۔ حکومت اُس کو اخراج کا حکم نہیں دے سکتی ، اسی بنا پر یہ مسلمان اگر کسی دوسرے ملک میں کسی دوسرے ملک میں کسی جرم کا ارتکاب کر کے آیا ہے تو دار الاسلام کی حکومت کو حق ہو گا کہ وہ اسے سزا دے ۔

دار الاسلام کے ان شرائطِ سہ گانہ کو جو تقویمی ہیں نہ کہ تقسیمی ، پیش نظر رکھ کر سوچیے کہ دار الاسلام کی یہ تعریف آج کسی ملک پر صادق آتی ہے ، جیسا کہ ہم نے پہلے ایک موقع پر کہا تھا ۔ پھر کہتے ہیں کہ اگر آپ نے یہ کوئی اصطلاح ہی بنا لی ہے کہ جس ملک میں مسلمان اکثریت میں ہوں گے آپ اسے دار الاسلام کہیں گے تو بات دوسری ہے ۔ ورنہ یہی بات

تو یہ ہے کہ جس ملک میں فواحش و منکرات عام ہوں اور ملک کا قانون اُن کا انسداد نہ کرتا ہو اُس کو دارالاسلام کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک شاندار محل ہو جس میں برہنہ عورتوں کے مجسمے جا بجا نصب ہوں۔ اور اُس کے پُر تکلف آراستہ و پیراستہ کمروں میں کہیں طبلہ پر تھاپ پڑ رہی ہو، کہیں گھنگرو بج رہے ہوں اور کہیں "ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں" کا ہنگامہ برپا ہو اور ان تمام خصوصیات کے باوجود آپ فرمائیں کہ یہ قصرِ رفیع الشان "شیخ حرم" کی رہائش گاہ ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ لا مشاحۃ فی الاصطلاح کی آڑ لے کر آپ تسمیۃ الشیٔ باسمِ غیرہٖ کی زد سے نہیں بچ سکتے۔ علاوہ ازیں آج پاسپورٹ اور ویزا کے جو قواعد و ضوابط ہیں اُن کی سختی کا یہ عالم ہے کہ جو مسلمان حجازِ مقدس جاتے ہیں، ان کو ویزا میں یہ ہدایت ہوتی ہے کہ وہ وہاں کوئی کاروبار یا ملازمت نہ کریں گے۔ اور وہاں بھی شہری حقوق حاصل کرنے کے وہی قواعد و ضوابط ہیں جو دوسرے ملکوں میں ہیں، ان امور کے پیشِ نظر دو حال سے خالی نہیں، اگر دارالاسلام کی تعریف اور اُس کے خصوصیات اب بھی وہی ہیں جو فقہ کی کتابوں میں درج ہیں اور جن کی وجہ سے اسم اور مسمی میں مطابقت پیدا ہوتی ہے تو پھر بتانا ہوگا کہ ان اوصاف و خصائص کا حامل کونسا ملک ہے اور یا دارالاسلام کی کوئی نئی تعریف ایسی کرنی ہوگی جس کے ماتحت مسلمانوں کی اکثریت والے ملک دارالاسلام کہلا سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ باوجود ان تمام باتوں کے جن کا ذکر ابھی ہوا۔ مسلمانوں کی اکثریت والے ممالک جہاں مسلمان صدرِ مملکت ہے فقہا کے اُن بیانات کی روشنی میں جنھیں ہم سابق میں نقل کر آئے ہیں دارالاسلام ہی ہیں، لیکن ان ممالک کی کیا خصوصیت ہے۔ ان بیانات کی رُو سے تو ہندوستان اور دوسرے غیر مسلم اکثریت برطانوی عہد کے ہندوستان کو کس کثرت سے علماء نے دارالاسلام لکھا اور کہا ہی ہے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ چونکہ دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاح کہیں قرآن میں نہیں ہے اور عہدِ نبوت و عہدِ صحابہ میں بھی اس کا سراغ نہیں ملتا، پھر قدیم مصنفین کی کتابوں میں عام طور پر بجائے دارالاسلام کے "دار ما" "ہمارا ملک" یا "ہمارا وطن"

کے الفاظ ملتے ہیں[۵۱]۔ علاوہ ازیں کتبِ فقہ میں دارالاسلام کے ساتھ "دارالمسلمین" کا لفظ بھی مستعمل ہوا ہے[۵۲]۔ اور اس زمانہ میں بدقسمتی سے کوئی ملک ایسا نظر بھی نہیں آتا جس پر اسلام فخر کر سکے اور جو (فقہاء کے بیانات سے قطعِ نظر) صورۃً ومعنیً دارالاسلام ہو اس بنا پر ہمارے زمانہ میں شہریت اور قومیت یا جنسیت کا جو بین الاقوامی تصور قائم ہو گیا ہے اور جسے مسلم اور غیر مسلم سب ممالک نے اختیار کر لیا ہے، ہم کیوں نہ اُس کی روشنی میں دار کی ایک نئی قسم معین کریں۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مسلم اکثریت کے ممالک کا ذکر محض ضمناً آ گیا ہے۔ ورنہ اس مقالہ کا اصل موضوعِ بحث ہندوستان ہے، اور اسی سے ہمیں سروکار ہے۔ یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ سب ہندوستانی مذہب اور زبان اور رنگ ونسل کے اختلاف کے باوجود دستوری اور آئینی طور پر ایک قوم (nation) ہیں اور مسلمان بھی اس کا ایک جز ہیں، چنانچہ پاسپورٹ۔ ویزا۔ شہری حقوق۔ قومی اور بین الاقوامی معاملات ومسائل۔ ان سب امور میں ان کے ساتھ جو معاملہ یا برتاؤ ہوتا ہے وہ ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے، ان کی یہ وہ حیثیت ہے جس کو خود انھوں نے تسلیم کیا ہے، اور انٹرنیشنل لا کے ماتحت دنیا کی سب مسلم اور غیر مسلم حکومتوں اور قوموں نے کیا ہے۔ اس بنا پر ہندوستان کسی ایک مذہب یا گروہ کا نہیں بلکہ اُن تمام لوگوں کا وطن (دار) ہے جو انڈین نیشنلٹی رکھتے اور انڈین نیشن کا جز ہیں۔

ایک انسان کا دوسرے انسان سے یا ایک گروہ کا دوسرے گروہ سے جو تعلق یا رابطہ (association) ہوتا ہے وہ بہت سے دائروں میں تقسیم ہے اس سلسلہ کا سب سے بڑا دائرہ وہ ہے جس میں ربط بربنائے انسانیت ہوتا ہے۔ اس کے بعد مذہب اور پھر وطن کے دائرے ہیں کسی دائرہ کے بڑے ہونے کے معنیٰ یہ ہرگز نہیں کہ وہ اُس سے چھوٹے دائروں سے زیادہ اہم ہے۔ البتہ ہر دائرہ کے حدود اور اُس کے اپنے

---

[۵۱] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جدید ایڈیشن جلد ۲ ص ۱۲۷۔

[۵۲] ملاحظہ کیجیے المبسوط للسرخسی ج ۱۰ ص ۱۱۴ باب المرتدین۔

مقتضیات و مطالبات ہیں، بہرحال انسانی علائق و روابط کے یہ دائرے طبعی اور فطری ہیں، اس بنا پر اسلام بھی انھیں تسلیم کرتا اور اُن کے حدودِ اربعہ متعین کرکے ہر ایک کے واجبات و مطالبات کی تشخیص کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں پیغمبروں نے جگہ جگہ اپنے اہلِ وطن کو یاقومنا۔ یا یاقومی، کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان لوگوں کے لیے جن میں آپ مبعوث ہوئے قوم کہا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن میں امۃ کا لفظ بھی قوم کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وما من امۃٍ الا خلا فیہ نذیر اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہونچ کر یہود سے جو معاہدہ کیا تھا اُس میں بھی مسلمانوں اور یہود سب کو امۃ واحدۃ فرمایا، پس جب اس وطنی اشتراک کو قرآن تسلیم کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے تسلیم کیا اور اُس کی اساس پر آپؐ نے غیر مسلموں سے معاملات طے کیے اور ان لوگوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ کیا اس بنا پر ہندوستان کی شرعی حیثیت یہاں کے مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ یہ اُن کا الوطن القومی (national home) ہے اور اس کے لیے جداگانہ احکام ہیں یوں تو اسلام کی تعلیمات کی رو سے دنیا کے سب انسانوں کے ساتھ ہی برو قسط اور احسان و کرم اور خدمت و اعانت کا معاملہ ہونا چاہیے۔ لیکن الاقرب فالاقرب کے ماتحت جو جتنا قریب ہے اتنا ہی اس کا حق ہے، اسی بنا پر قرآن میں ذوی القربیٰ کو دوسرے مستحقینِ امداد و اعانت پر مقدم رکھا گیا ہے۔

قومی وطن ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس ملک کو ترقی دینے اور اسے مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں اُن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اور جہاں کہیں ظلم و بے انصافی ہو اُس کے خلاف آواز اٹھائیں اور عدل و احسان کے قیام اور منکر و فحشا سے اس ملک کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں کے ذہن اور دماغ، اُن کی صلاحیتِ کار۔ اُن کی دولت و ثروت اور اُن کے اخلاق و کردار پہ صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ اس ملک کے ہر مرد اور ہر عورت کا حق ہے۔ جس زمانہ میں

مسلمانوں کی طاقت وقوت اور اُن کی حکومت وسلطنت کا ڈنکا بجتا تھا اُس زمانہ میں بھی مسلمانوں کا عمل اصولِ فقہ کے اس مشہور اصول پر تھا :

المسلم والکافر فی مصائب الدنیا سواءٌ [1]	مسلمان اور غیر مسلم دنیوی مصائب وحوادثات میں برابر ہیں۔

اسلام میں شرک سے زیادہ مبغوض کوئی چیز نہیں، لیکن اس کے باوجود مشرک کے متعلق بھی حکم یہ ہے کہ اگر وہ پناہ مانگے تو مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اسے پناہ دے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ۔	اگر کوئی ایک مشرک بھی تجھ سے پناہ طلب کرے تو اس کو پناہ دے۔

پس جس مذہب کی تعلیمات یہ ہوں اُس کے ماننے والوں کو محسوس کرنا چاہیے کہ برادرانِ وطن اور خود وطن کے ساتھ ان کا معاملہ کیا ہونا چاہیے۔



(1) The muslim conduct of state by Dr. Hamidullah. p. 71.

باب پنجم

پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت

اور

اس میں غیر مسلموں کا درجہ و مقام

پچھلے دنوں نہرو لیاقت معاہدہ کے موقع پر وزیر اعظم پاکستان نے پنڈت نہرو سے کہا اور پھر پریس کانفرنس میں بیان دیتے ہوئے بھی انھوں نے اس کی تصریح کی کہ پاکستان ایک عہد حاضر کی جدید قسم کی جمہوریت (modern democratist) ہے اور اس بنا پر اس میں غیر مسلموں کو وہی شہری حقوق حاصل ہیں جو وہاں کے مسلمانوں کو ہیں۔ سول اور ملٹری کے تمام محکمے، اسمبلی کی ممبری، ووٹ دینے کا حق، عقیدہ و عمل کی آزادی ان سب چیزوں کے دروازے ان کے لیے اسی طرح کھلے ہوئے ہیں جس طرح وہ مسلمانوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ یاد ہوگا کہ بعینہٖ یہی بات پاکستان کے مرحوم مؤسس اول نے اس وقت کہی تھی جب کہ پاکستان بننے کے بعد انھوں نے پہلی تقریر دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی تھی بلکہ اپنے مقصد کو زیادہ مؤکد کرنے کے لیے انھوں نے یہاں تک فرمادیا تھا کہ "اب پاکستان میں نہ کوئی ہندو ہوگا اور نہ کوئی مسلمان بلکہ پاکستان کا ہر باشندہ بلاتفریق مذہب و ملت صرف پاکستانی ہوگا، اور اس کے ساتھ اسی حیثیت سے معاملہ کیا جائے گا۔"

لیکن پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اپنے بنیادی مقصد کے رزولیوشن میں پاکستان کو اسلامی حکومت قرار دے چکی ہے۔ تو اب اس پر غور کرنا چاہیے کہ بانیٔ پاکستان اور وزیر اعظم پاکستان کے یہ اعلانات "اسلامی حکومت" کے اعلان کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر رکھتے ہیں تو اس چیز کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

صاف اور واضح ہونا چاہیے۔ ورنہ جس طرح بھارت میں ہندو مہاسبھا وغیرہ قسم کی چند پارٹیاں ہیں جن کے نزدیک یہاں ہندو راج یا رام راج قائم ہونا چاہیے، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے۔ باقی ان کے علاوہ دوسری قومیں یہاں کی شہری نہیں ہو سکتیں، اسی طرح پاکستان میں کچھ جماعتیں ہیں جن کے خیال میں اسلامی حکومت کا مفہوم یہ ہے کہ جو غیر مسلم وہاں رہیں گے تو اگرچہ ان کی جان و مال کی حفاظت کرنا اسلامی حکومت کا فرض ہوگا لیکن ان کو وہ تمام شہری حقوق حاصل نہیں ہو سکتے جو مسلمانوں کو ہوں گے اس بنا پر اس بات کا اندیشہ ہے کہ جس طرح بھارت میں ہندو مہاسبھا وغیرہ نے اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے یہاں کی اکثریت کے غلط مذہبی تصورات کو آلہ کار بنا کر ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے، اسی طرح ممکن ہے کہ اب یا الکشن کے موقع پر اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنے کی غرض سے پاکستان کی یہ جماعتیں گورنمنٹ پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کریں اور "اسلامی حکومت" کے غلط تصور کو پیش کر کے عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

علاوہ بریں اس مقالہ کا ایک بڑا محرک یہ بھی ہے کہ حالیہ فسادات کے باعث اشتعال پذیری کے عالم میں چند گستاخ و بدزبان اخبارات و رسائل نے پاکستان کو برا کہتے کہتے اسلام اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں بھی حد درجہ مکروہ و ناشایستہ الفاظ استعمال کیے ہیں جہاں تک ان کی بدزبانی اور دریدہ دہنی کا تعلق ہے تو ہم اس کے جواب میں اس سے زیادہ نہیں کہنا چاہتے کہ ایک بھاری اور مقتدر اکثریت کے فرقہ سے تعلق رکھتے ہوئے کسی دست و پاشکستہ اقلیت کے مذہب اور اس کے پیغمبر کی شان میں اس طرح گستاخ زبانی کرنا کمینہ پن کی وہ آخری منزل ہے جہاں انسانیت لڑکھڑا کر گر پڑتی ہے اور اگر ہم چاہیں تو جواب ترکی بہ ترکی دے کر اپنے ان حریفوں کو برسوں انگاروں پر لٹا بھی سکتے ہیں۔

تم کو بھی ہم بتائیں کہ مجنوں نے کیا کیا ۔۔۔ فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

بہرحال جہاں تک اس مسئلہ کی وضاحت کا تعلق ہے۔ ہم اسے بیان کرتے ہیں

تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں سمجھ سکیں کہ اگر پاکستان واقعی اسلامی حکومت ہے بھی تو اس کے غیر مسلموں کا وہاں کی حکومت میں درجہ و مقام کیا ہے ؟ اور وزیرِ اعظم پاکستان نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اس میں اسلامی حکومت کے تصور کے لحاظ سے کس درجہ واقعیت اور سچائی ہے ؟

دینی حکومت اور اسلامی حکومت میں فرق :

شروع میں اس غلط فہمی کا دور کر دینا ضروری ہے کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ دینی حکومت اور اسلامی حکومت دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ عنوان مختلف ہے مگر معنون ایک ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے ان دونوں میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے جو حکومت اسلامی آیڈیالوجی کے مطابق دینی ہو گی وہ اسلامی ضرور ہو گی لیکن جو حکومت کسی خاص اعتبار سے اسلامی ہو اس کا دینی ہونا ضروری نہیں ہے " وجہ یہ ہے کہ دینی حکومت کا ہر عمل دینی ہو یا دنیوی بہر حال اس میں تعبد اور تقرب الی اللہ کا پہلو غالب رہتا ہے پھر یہ حکومت کسی انسان کی۔ فرد ہو یا جماعت، نہیں ہوتی بلکہ اِنِ الحُکمُ اِلَّا لِلّٰہِ کے مطابق صرف خدا کی ہوتی ہے، اور اسی وجہ سے اس کو حکومتِ الٰہیہ کہا جاتا ہے، اس حکومت کا صدر جو امام کہلاتا ہے اسے لوگوں پر مذہبی سیادت بھی حاصل ہوتی ہے اور سیاسی بھی۔ اسی لیے اس کا متقی اور پرہیزگار ہونا ضروری ہے۔ وہ گویا خدا کی طرف سے اس کے احکام کے اجراء و تنفیذ کا ذمہ دار ہوتا ہے اس حکومت میں آج کل کی جمہوریتوں کی طرح کی نہ دستور ساز اسمبلی ہو سکتی ہے اور نہ کونسلیں اور نہ پارلیمنٹ۔ قانون سازی کا حق سوائے علماء ربانیین کے کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ پھر اس میں نہ حلقہ وار انتخاب ہے اور نہ آبادی کے تناسب سے نمایندگی اس بنا پر یہ بالکل صاف ظاہر ہے کہ پاکستان گورنمنٹ کسی طرح بھی دینی حکومت نہیں کہلائی جا سکتی اور ایک یہ ہی کیا۔ خلافت راشدہ کے بعد یہ دینی حکومت رہی ہی کہاں ہے ؟ خود غرض بادشاہوں نے اپنے لیے "ظل اللہ علی الارض" اور "خلیفۃ اللہ علی الناس" ایسے کیا کچھ القاب اختیار نہیں کیے۔

لیکن تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ خود ان کی اور ان کی مزعومہ خلافت کی حقیقت کیا تھی؟ جن لوگوں نے بنو امیہ کی نعشوں پر بیٹھ کر جشن دعوت منایا تھا خطبوں میں میز پر بیٹھ کر وہی اپنے آپ کو اللہ کے دین کے سب سے بڑے محافظ کہتے تھے تیمور لنگ جو سفاکی و بے رحمی کے میدان کا نامور ہیرو تھا وہ بھی اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ میں ہندوستان اسلام کے سرنگوں عَلَم کو اونچا کرنے گیا تھا۔ بہرحال دعاوی خواہ کچھ رہے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دَور کے بعد امامت۔ خلافت یا دینی حکومت صحیح معنیٰ میں کبھی قائم نہیں ہوئی۔ عبدالملک بن مروان جو خلیفہ ہونے کے ساتھ بڑا عالم اور فقیہ بھی تھا کسی نے اس سے پوچھا کہ تم حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے نقش قدم پر کیوں نہیں چلتے" تو اس نے کہا کہ ان کے زمانہ میں لوگ بھی تو تم جیسے نہیں تھے واقعہ یہ ہی ہے کہ کسی حکومت کی نوعیت کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ لوگ کیسے ہیں؟ اس بنا پر خلافت راشدہ بھی اگر خیر القرون سے آگے نہیں بڑھ سکی تو اچنبھے کی کیا بات ہے؟ اسی بنا پر ہم کو خوشی ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم نے بڑی جرأت سے اپنے بیان میں صاف کہہ دیا کہ ان کی حکومت دینی (Theocratic) نہیں ہے۔

اسلامی حکومت:

اب رہی اسلامی حکومت! تو اگر ہم اسلام سے مراد ایک مخصوص قسم کا نظام زندگی لیں ـــــ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ کمیونزم وغیرہ دوسرے قسم کے نظام ہائے زندگی رائج ہیں ـــــ تو اس نظام کو جس حد تک کوئی حکومت اختیار کرے گی وہ اسی درجہ تک اسلامی کہلائے گی۔ جہاں تک اس نظام کے معاشی۔ معاشرتی اور مادی مسائل کا تعلق ہے اس نظام کو مسلمانوں کی طرح غیر مسلم بھی اختیار کر سکتے ہیں اور پھر بھی وہ نظام اسلامی نظام ہی کہلائے گا۔ کسی غیر مسلم کے اپنانے سے وہ غیر اسلامی نہیں ہو جائے گا۔ مثلاً اقوام متحدہ کی کونسل نے آج انسانی حقوق کا چارٹر بنایا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسلامی چارٹر ہے۔ اسی طرح ہماری پارلیمنٹ میں آج جو ہندو کوڈ بل پیش ہے، کہا جا سکتا ہے کہ یہ بل اپنی متعدد دفعات کے اعتبار سے اسلامی قانون ہے،

دوسرے لفظوں میں اسے اس طرح سمجھیے کہ مثلاً اگر ایک غیر مسلم کسی مظلوم کی مدد کر رہا ہے یا اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کسی کی جان بچا رہا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا یہ فعل اسلامی ہے لیکن ہم اس کو دینی نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ دینی فعل پر احکام تعبدی مرتّب ہوتے ہیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ فاعل مسلمان ہو پس احکام دنیویہ کے اعتبار سے جس طرح جزوی طور پر زندگی کے کسی ایک شعبہ میں اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنا اسلامی فعل ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ملک خواہ وہ مسلمانوں کا ہو یا غیر مسلموں کا، یا دونوں کا اپنی حکومت کے لیے جو دستور مرتب کرتا ہے وہ اسلامی نظام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور ملکی و وطنی معاملات۔ اقتصادی و معاشی مسائل، غیر قوموں کے ساتھ تعلقات صلح و جنگ کے قوانین وغیرہ ان سب چیزوں میں وہ اسلامی نظام کی پیروی کرتا ہے تو بے شبہ اس ملک کی حکومت۔ حکومتی امور کی حد تک اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق ہے، یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ محض اسلامی حکومت کا نام سن کر یہ سمجھ لینا کہ یہ حکومت فرقہ وارانہ ہو گی، صحیح نہیں ہے اگر ایک کمیونسٹ یا سوشلسٹ گورنمنٹ کا مفہوم فرقہ وارانہ گورنمنٹ نہیں ہے تو اسلامی حکومت کہنا بھی فرقہ وارانہ گورنمنٹ کے مرادف نہیں ہو سکتا البتہ ہاں اگر اس حکومت کے آئین میں کسی فرقہ کی حق تلفی ہوئی ہو تو بے شبہ اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے ہم اس پر بحث کرنا چاہتے ہیں لیکن چونکہ ہمارے مقالہ کا موضوع محدود ہے اس لیے گفتگو صرف غیر مسلموں کے درجہ و مقام تک ہی رہے گی !!!

قیامِ پاکستان کی نوعیت :

چونکہ کسی چیز کی نوعیت کے بدل جانے سے اس چیز کا حکم بھی بدل جاتا ہے، اس لیے سب سے پہلے ہمیں قیامِ پاکستان کی نوعیت معلوم کرنی چاہیے، ظاہر ہے یہ نوعیت اپنی حیثیت میں بالکل منفرد ہے۔ یعنی بعینہ اس کی کوئی نظیر تاریخ اسلام میں نہیں ملتی۔ البتہ اس کے مختلف پہلو ہیں جن پر تاریخ کے بعض واقعات سے روشنی پڑتی ہے اور اسی روشنی میں اس کے لیے احکام کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے قیام کی

صورت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ملک میں رہتے بستے ہیں اس ملک پر ایک اجنبی طاقت کا قبضہ ہے، ہندو اور مسلمان دونوں اس طاقت کو ملک سے نکال باہر کرنے اور اپنے ملک پر قبضہ کرنے کے لیے مشترکہ جدوجہد کرتے ہیں، ایک عرصہ تک مشترکہ جدوجہد کرنے کے بعد چند ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کے باعث مسلمان تقسیم کا مطالبہ کرتے ہیں بڑی ردوکد کے بعد آخر ہندو اس تقسیم کو منظور کر لیتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک آزاد ہو کر دو حصوں میں بٹ جاتا ہے، ایک حصہ میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور ہندو اقلیت میں اور دوسرے حصہ میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور مسلمان اقلیت میں ہیں چونکہ ہندوستان کے ہندو پاکستان کے ہندوؤں سے اور پاکستان کے مسلمان ہندوستان کے مسلمانوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے اور پھر دونوں ملکوں کی اقلیتوں کو اطمینان دلائے بغیر ملک کی تقسیم عمل میں نہیں آسکتی تھی اس بناء پر دونوں پارٹیوں میں جو ملک کی تقسیم کا معاملہ کر رہی تھیں یہ معاہدہ ہوا کہ ہر ملک کی اکثریت اپنی اقلیت کے ساتھ برابر کا معاملہ کرے گی اور اسے مساوی درجہ کے شہری حقوق دے گی، یہ معاہدہ تقسیم کے وقت کاغذ پر ایک سیاسی معاہدہ کی حیثیت سے ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ لیکن کم از کم اخلاقی معاہدہ کی حیثیت سے ضرور ہوا ہے اور اس کا ثبوت وہ بیانات و اعلانات ہیں جو اس زمانہ میں دونوں پارٹیوں کے ذمہ دار لیڈروں نے کیے اور دیے تھے۔

پس یہ ظاہر ہے کہ پاکستان کا قیام نہ مسلمانوں کی فوج کشی سے ہوا ہے اور نہ تلوار سے بلکہ ہندوؤں کے ساتھ باہمی سمجھوتہ اور معاہدہ کی رو سے ہوا ہے۔ علاوہ بریں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ساڑھے تین کروڑ مسلمان ایک ایسے ملک میں رہ جاتے ہیں جہاں اگرچہ اقتدار اعلیٰ ان کے ہاتھ میں نہیں ہے لیکن اس ملک کے گوشہ گوشہ میں ان کی عبادت گاہیں ہیں۔ مدارس ہیں۔ ملی ادارے ہیں، اور جا بجا ان کے تاریخی و مذہبی مآثر بکھرے پڑے ہیں، ان دونوں امور کو پیش نظر رکھنے کے بعد اصل مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لیے حسب ذیل تنقیح طلب امور سامنے آتے

ہیں اور انھیں کی روشنی میں موضوعِ گفتگو کا تصفیہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) مسلمان غیر مسلموں سے معاہدہ کس حد تک کر سکتے ہیں۔

(۲) معاہدہ کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

(۳) ہندوستان میں مسلمانوں کی دستوری اور آئینی پوزیشن کیا ہے۔

(۴) اس پوزیشن کے پیشِ نظر پاکستان کا اپنی اقلیت کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے۔

اب ہم ان امورِ تنقیح طلب میں سے ہر ایک پر نمبروار گفتگو کرتے ہیں۔

مسلمان غیر مسلموں سے معاہدہ کس حد تک کر سکتے ہیں!

یوں تو تاریخ اسلام میں ہر قسم کے معاہدے ملتے ہیں یہاں تک کہ ہارون رشید نے شارلمان کے ساتھ اسپین کی اموی حکومت کو ختم کرنے کے ارادہ سے دوستانہ عہد نامہ کیا تھا۔ لیکن عہد نبوت کے دو معاہدے ہیں جو اسی قسم کے مسائل کے لیے ایک بنیادی دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں، صلح حدیبیہ کے موقع پر آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے قریش مکہ سے جو معاہدہ کیا تھا وہ اس درجہ مشہور ہے کہ اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں البتہ یہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اس معاہدہ میں بہ ظاہر مسلمانوں کا پلہ قریشِ مکہ کے مقابلہ میں کچھ بھاری نہیں تھا۔ چنانچہ قریش کے نمایندہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے نام مبارک کے ساتھ "رسول اللہ" لکھنے پر اعتراض کیا تو باوجود بعض صحابہ کے احتجاج کے آپ نے اس کو خود اپنے دست مبارک سے مٹا دیا، اسی طرح معاہدہ میں ایک دفعہ تھی کہ مکہ کا کوئی شخص مسلمانوں سے آملے گا تو اس کو مکہ واپس کرنا ضروری ہوگا۔ لیکن اس کے برخلاف اگر کوئی ادھر کا آدمی مکہ پہنچ جائے گا تو قریش پر اس کا واپس کرنا لازمی نہیں ہوگا۔ حضرت عمر رض نے اس پر آپ سے تند لہجہ میں احتجاج کیا جس کی ندامت ان کو مدت تک رہی لیکن اس کے باوجود آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس دفعہ کو بھی منظور فرمالیا۔ بہرحال صلح حدیبیہ کا واقعہ اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ اگر کسی وجہ سے غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ ناگزیر ہو جائے اور اس میں مسلمانوں کا

پہلو مادی اور فوری نفع کے اعتبار سے کچھ دبا ہوا بھی نظر آئے تو مسلمانوں کو اللہ کی مدد کے بھروسہ پر یہ معاہدہ ضرور کر لینا چاہیے، خدا نے چاہا تو یہی معاہدہ ان کی آخری جیت کا سبب ہو گا۔

صلح حدیبیہ کے واقعہ کے علاوہ ایک اور معاہدہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کر کے پہنچنے کے بعد وہاں کے مختلف یہودیوں سے کیا تھا۔ پاکستان کی اقلیت کے شہری حقوق پر اس معاہدہ سے خاص طور پر روشنی پڑتی ہے۔ سیرت ابن ہشام اور کتاب المغازی وغیرہما میں اس کا مفصل تذکرہ ہے، ہمارے موضوع بحث سے اس معاہدہ کا صرف یہ حصہ متعلق ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ (عہد نبوی میں نظام حکمرانی) یہودیوں کے ساتھ مل کر ایک سیاسی وحدت بنائی تھی، چنانچہ اس عہد نامہ کی پچیسویں دفعہ کا مضمون ہی یہ تھا کہ "بنو عوف کے یہودی مومنوں کے ساتھ ایک امت (ایک قوم یا ایک سیاسی وحدت) تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہودیوں کو ان کا دین اور مسلمانوں کو ان کا دین موالی ہوں کہ اصل ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کرے گا تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوا کوئی مصیبت میں نہیں پڑیگا پھر دفعہ ۳۷ الف میں ارشاد ہوا تھا کہ "جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان یہودیوں اور مسلمانوں میں باہم امداد عمل میں آئے گی اور ان میں باہم حسن مشورہ اور بہی خواہی ہوگی اور وفاشعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

پروفیسر ہارون خاں شیروانی سابق صدر شعبۂ تاریخ وسیاسیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن اس معاہدہ کی نسبت بجا طور پر فرماتے ہیں کہ:

"آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر بڑی دور اندیشی اور سیاسی بصیرت اس طرح دکھائی کہ آپ نے یہودیوں کے لیے ایک دستور مرتب فرمایا جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ یہودی بھی سٹی اسٹیٹ کے ایسے ہی شہری ہیں جیسے کہ خود مسلمان اور شریعہ کے لوگوں کی دونوں شاخیں مل کر ایک قوم ہیں"[۱]

---

[۱] The muslim political thought and administration, p. 20

معاہدہ کی ذمہ داریاں :

اسلام کا اصل مقصد ہی تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن ہے، اس بنا پر منافقت اور دل و زبان کی مخالفت سے بڑھ کر اس کے نزدیک کوئی اور گناہ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہے :

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○

اسی لیے معاہدہ پر قائم رہنے اور عہد و پیمان پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید جتنی اسلام میں ہے کہیں اور نہیں ملے گی۔ اسلام کے نزدیک شرک سے زیادہ قبیح اور کیا چیز ہوگی لیکن اس کے باوجود حکم ہے کہ مشرکوں سے بھی اگر کوئی معاہدہ کر لیا گیا ہے تو جب تک وہ خود نہ توڑیں تم ہرگز نہ توڑو۔ سورۂ التوبۃ میں ہے :

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○

اسی سورۃ میں دوسری جگہ ہے :

فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ

معاہدہ کی پابندی کا حکم اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا ہے مسلمانوں کی امداد سے اگر اس کا نقض لازم آتا ہو تو حکم ہے کہ معاہدہ کی پابندی کرو اور مسلمانوں کی مدد نہ کرو۔ چنانچہ سورۂ انفال میں ہے :

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ	جو لوگ ایمان لائے ہیں اور
يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ	ہجرت نہیں کی تم کو ان کی کوئی
وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى	ولایت (نگرانی) نہیں پہنچتی جب تک
يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ	کہ وہ ہجرت کریں اور اگر یہ لوگ
فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ	دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں
اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ	تو ان کی مدد تم پر لازم ہے لیکن ہاں

بَيْنَهُمْ مِيْثَاقٌ ۔ ان لوگوں کے برخلاف نہیں جن کے ساتھ کہ تمہارا کوئی معاہدہ ہے۔

غور کرو یہ آیت ہندوستان کے مسلمانوں پر جنہوں نے ہجرت نہیں کی ہے اور پاکستان کی اقلیت جن کے ساتھ وہاں کی گورنمنٹ کا عہد ہے کس طرح منطبق ہورہی ہے۔

چند فقہی جزئیات :

قرآن مجید کی انہیں آیات اور بعض احادیث کو بنیاد بنا کر فقہانے جزئیات مستنبط کیے ہیں ہم ذیل میں ان میں سے چند بیان کرتے ہیں۔ علامہ سرخسی لکھتے ہیں کہ:

"اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں وہاں کی حکومت کی اجازت سے چلا گیا ہے اور اس نے وہاں کسی کا مال غصب کر لیا ہے یا کوئی نقصان پہنچا دیا ہے تو اگر اس کے بعد وہ مسلم حکومت میں پھر واپس آجائے اور جن لوگوں کا مال غصب کیا تھا وہ مسلم حکومت میں آکر اس مسلمان کے خلاف استغاثہ کریں تو مسلمان عدالت اس استغاثہ کو نہیں سنے گی کیونکہ یہ واقعہ مسلم حکومت کے حدود کے باہر پیش آیا تھا چنانچہ اسی بنا پر اگر معاملہ برعکس ہو یعنی جو مسلمان غیر مسلم ملک میں چلا گیا تھا اس کے مال یا جائداد کو وہاں کے لوگوں نے کوئی نقصان پہنچا دیا ہے، اور یہ شخص اپنے ملک میں واپس آکر ان غیر مسلموں کے خلاف کوئی استغاثہ کرے تو مسلم عدالت اس استغاثہ کو بھی نہیں سُنے گی۔ البتہ ہاں جہاں تک غیر مسلم حکومت میں رہ کر مسلمان کے کسی غیر مسلم کے مال کو غصب کرنے کا تعلق ہے تو چونکہ اس نے غیر مسلم حکومت کے ساتھ معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے اس لیے اس پر دباؤ ضرور ڈالا جائے گا کہ وہ مال اس کے مالک کو واپس کر دے اور کوئی مسلمان اس کو نہ خریدے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو کوئی شخص معاہدہ کی خلاف ورزی کرے گا

قیامت کے دن اس کے سر پر ایک جھنڈا لہرایا جائے گا تاکہ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص دھوکہ باز تھا[۵]

اگر ایک مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں وہاں کی حکومت سے اجازت لے کر چلا گیا ہے تو اسے جن شرائط پر یہ اجازت ملی ہے اس کا اسلامی فرض ہے کہ وہ ایمانداری اور سچائی کے ساتھ ان شرائط کو پورا کرے۔ یہاں تک کہ اگر اس درمیان میں اسلامی ملک اور اس غیر مسلم حکومت میں جنگ چھڑ جائے تو اس مسلمان کا فرض ہے کہ غیر مسلم حکومت میں رہتے ہوئے اپنی اسلامی حکومت کی حمایت میں کوئی حرکت غیر مسلم حکومت کے خلاف ہرگز نہ کرے ورنہ معاہدہ کی خلاف ورزی کے جرم کا مرتکب ہوگا[۶]

اسی سلسلہ میں علامہ سرخسی لکھتے ہیں کہ اگر دونوں ملکوں کی جنگ کی صورت میں اسلامی ملک کی عورتیں اور بچے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم (ذمی) گرفتار ہو کر غیر مسلم ملک میں جہاں وہ مقیم ہے لائے جا رہے ہوں اور وہ محسوس کرے کہ وہ ان عورتوں اور بچوں کی مدد کر سکتا ہے تو اس کو چاہیے کہ غیر مسلم حکومت نے اس کو جو امن دے رکھا ہے پہلے وہ اس سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دے اور پھر ان عورتوں اور بچوں کی مدد کرے، اس جزیہ میں دو باتیں خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

(۱) جب تک وہ غیر مسلم حکومت کے دیے ہوئے امن کو رد کر دینے کا اعلان نہیں کرے گا خود اپنے ملک کی عورتوں اور بچوں کی مدد بھی نہیں کر سکتا۔ ورنہ عہد شکنی کے جرم کا مرتکب ہوگا۔

(۲) ان عورتوں اور بچوں میں مسلمان اور غیر مسلمان کا کوئی فرق نہیں ہے، دونوں کو جو اسلامی ملک کے باشندہ ہوں جہاں کا وہ خود بھی شہری ہے، ایک ہی حکم دیا گیا ہے۔

---

[۵] مبسوط ج ۱۰ ص ۹۵ [۶] ایضاً ص ۹۸۔

عدل گستری :

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جذبات کی اشتعال پذیری کے عالم میں انسان کو اپنے قول و قرار کا دھیان نہیں رہتا اور وہ ایسا کام کر بیٹھتا ہے جو اسے اپنے عہد و پیمان کے مطابق نہ کرنا چاہیے تھا۔ قرآن مجید میں اس پر بھی نہایت سختی سے متنبہ کیا گیا ہے، ارشاد ہے :

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ	خبردار کسی قوم کا بغض تم کو اس پر آمادہ
قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا	نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو نہیں بلکہ
اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ	تم انصاف ہی کرو، یہ ہی تمہارے لیے
لِلتَّقْوٰى۔	پاکی کا سب سے قریبی راستہ ہے۔

اسلام نے عدل کی اہمیت و عظمت مسلمانوں کے دل و دماغ پر کس درجہ حاوی کر دی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سیاست نامہ کا مصنف لکھتا ہے :

"حکومت کفر کے ساتھ رہ سکتی ہے لیکن ظلم اور نا انصافی کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی[1]"

مسلمان حکمرانوں نے عدل کی جو نادرۂ روزگار مثالیں قائم کی ہیں تاریخ کے صفحات ان سے بھرے پڑے ہیں، خود ہندوستان میں دہلی سلطنت کے بعض واقعات ایسے ہیں جن پر آج یقین کرنا بھی مشکل ہے۔ سلطان محمد بن تغلق کو کون نہیں جانتا کس قدر تند مزاج اور درشت طبع بادشاہ تھا لیکن اسلام نے جو ایک خاص ماحول پیدا کر دیا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ ابن بطوطہ قیام دہلی کے زمانہ کا خود اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی ہندو نے قاضی کی عدالت میں فریاد کی کہ بادشاہ نے اس کے لڑکے کو بلا وجہ دھکا مارا ہے، قاضی نے عدالت میں بادشاہ کو مدعیٰ علیہ کی حیثیت سے طلب کیا۔ محمد بن تغلق عدالت میں آیا تو قاضی کو تاکید کی کہ وہ اس کے احترام کے لیے کھڑا نہ ہو۔ مقدمہ شروع ہوا اور قاضی

---

[1] ص ۸

نے دونوں طرف کے بیانات وغیرہ سننے کے بعد فیصلہ بادشاہ کے خلاف کیا۔ اس پر بادشاہ نے کوڑا خود ہندو لڑکے کے ہاتھ میں دیا اور باصرار کہا کہ جس طرح میں نے تجھ کو مارا ہے تو بھی اسی طرح مار۔ یہ واقعہ ضیاء الدین برنی نے بھی بیان کیا ہے اور دوسرے مورخوں نے بھی اسے نقل کیا ہے، لیکن ابن بطوطہ نے اسی طرح کے اور بھی متعدد واقعات محمد بن تغلق کے متعلق بیان کیے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے عدالت میں دعویٰ کیا کہ سلطان میرا مقروض ہے تو نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان خود قاضی کے سامنے مدعیٰ علیہ کی حیثیت سے پیش ہوا اور عدالت کے فیصلہ کے مطابق اس نے قرض ادا کیا۔

غیاث الدین بلبن کو ایک گورنر کی نسبت معلوم ہوا کہ اس نے کسی شخص کو نشہ کے عالم میں قتل کر دیا ہے تو اس نے گورنر کو سخت ترین سزا دی، سلاطین دہلی نے "حسبہ" کے نام سے ایک مستقل محکمہ قائم کر رکھا تھا۔ اس محکمہ کا افسر محتسب کہلاتا تھا اور اس کا فرض عصامی کے بقول یہ تھا کہ وہ ملک میں کسی قسم کی اخلاقی بے عنوانی نہ ہونے دے، اور کوئی طاقت ور کسی کمزور پر دست درازی نہ کر سکے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آئینی پوزیشن :

اب آیئے یہ دیکھیں کہ بھارت میں مسلمانوں کی آئینی پوزیشن کیا ہے؟ اور اس کے پیش نظر از روے تعلیمات اسلام پاکستان میں وہاں کی اقلیتوں کی حیثیت (Status) کیا ہونی چاہیے، ظاہر ہے کہ بھارت کے دستور نے یہاں کی حکومت کو غیر مذہبی اور غیر فرقہ وارانہ قرار دیا ہے۔ جس میں مسلمانوں کو بھی بھارت کا ایسا ہی نیشنل مانا گیا ہے جیسا کہ خود ہندو ہیں اور شہری حقوق اور شہری آزادی کے لحاظ سے ان میں اور ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے ہر محکمہ اور ہر منصب کے دروازے ہندو اور مسلمان دونوں پر یکساں کھلے رکھے گئے ہیں اور پورے طور پر نہ سہی جو بعض ناگزیر اسباب کا نتیجہ ہے کسی نہ کسی شکل میں اس کا عملی ثبوت موجود بھی ہے۔ پس جہاں تک دستور ہند، گورنمنٹ کی پالیسی اور ذمہ داران حکومت

کے اعلانات کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی شہری اور قومی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور ان کو اکثریت کے برابر حقوق دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ فقہا نے لکھا ہے جس ملک میں ایسی صورت حال ہو یعنی اس میں مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود اپنے معاملات میں آزاد ہوں اور حکومت میں کسی نہ کسی حد تک مسلمانوں کا بھی دخل ہو وہ ملک مسلمانوں کے لیے دارالاسلام ہی کہلائے گا۔ چنانچہ درمختار میں ہے:

ودارالحرب تصیر دارالاسلام باجراء احکام الاسلام فیها کجمعة وعید۔	اور غیر مسلموں کا ملک جمعہ اور عید ایسے احکام کے جاری ہو جانے سے دارالاسلام ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اس مسئلہ کی مزید وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

وبهذا ظهر ان جبل الدروز وبعض البلاد التابعة له کلها دار الاسلام لانها وان کانت لها احکام دروز او نصاری ولهم قضاة علی دینهم وبعضهم یعلنون بشتم الاسلام والمسلمین لکنهم تحت حکم ولاة امورنا[1]	اور جبل دروز (شام) اور اس کے بعض ملحقہ شہروں میں ایسا ہوا بھی ہے۔ یہ تمام شہر دارالاسلام ہیں۔ کیونکہ یہاں اگرچہ دروز یا عیسائیوں کے احکام چلتے ہیں اور انھیں کے ہم مذہب جج بھی ہیں جن میں سے بعض بعض اسلام اور مسلمانوں کو کھلے بندوں سب و شتم بھی کرتے ہیں لیکن یہ لوگ ہمارے حکام کے نیچے ہیں (یعنی یہاں مسلمان حاکم بھی ہیں جن کے ماتحت یہ لوگ بھی ہیں)

احسان کا بدلہ احسان:

پس جب کسی غیر مسلم ملک میں مسلمانوں کی آئینی پوزیشن یہ ہو تو اب اس کے

---

[1] الدرالمختار ج ۳ ص ۳۵۰۔

ہمسایہ اسلامی ملک کا دینی اور مذہبی فرض ہے کہ بحکم هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الاحسان اپنے ہاں کے غیر مسلموں کو بھی یہ ہی مرتبہ اور مقام دے۔ فقہ کی کتابوں میں عام طور پر یہ حکم پایا جاتا ہے کہ اگر دار الحرب کی حکومت مسلمانوں کے ساتھ کوئی مراعات کر رہی ہے تو اسلامی حکومت کو چاہیئے کہ اس کے جواب میں وہ بھی دار الحرب کے رہنے والے غیر مسلموں کے ساتھ اس جیسا بلکہ اس سے بھی اچھا معاملہ کرے۔ چنانچہ شرح وقایہ میں ہے[1]:

وان علم قدر ما اخذ منا اهل الحرب نعاشرنا یاخذ من الحربی مثل ذالک۔	غیر مسلم حکومت مسلمانوں سے جو کسٹم ڈیوٹی وصول کرتی ہے اگر اس کی مقدار ہم کو معلوم ہو تو ہماری اسلامی حکومت کا کسٹم آفیسر بھی غیر مسلم سے اتنی ہی کسٹم ڈیوٹی لے گا۔

اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مندرجۂ بالا حکم صرف اس وقت ہے جب کہ غیر مسلم کا مال تجارت بقدر نصاب ہو اور غیر مسلم حکومت مسلمان سوداگر سے اس کے مال کا کچھ حصہ بطور کسٹم ڈیوٹی کے وصول کرتی ہو، ورنہ اگر غیر مسلم حکومت مسلمان تاجر کا پورا مال ہی قبضہ میں کر لیتی ہو یا غیر مسلم کا مال بقدر نصاب نہ ہو تو ان دونوں صورتوں میں اسلامی حکومت غیر مسلم حکومت کی پیروی نہ کرے گی بلکہ اس کے جبر و تشدد اور ظلم کے باوجود خود وہ ہی کرے گی جو اسے از روے انصاف کرنا چاہیے، شرح وقایہ میں مذکورہ بالا عبارت کے بعد ہی ہے۔

لو اخذوا كل اموالنا نعاشرنا لا یاخذ کل اموال الحربی المار ولا	اگر غیر مسلم حکومت کے عمال مسلمانوں کے کل مال پر قبضہ کر لیتے ہوں تو ہمارا کسٹم آفیسر غیر مسلم مسافر کے کل مال پر قبضہ نہیں

[1] ج ا باب العاشر

من قليلة وان اقر بباقي النصاب في بيته۔

کر ے گا، اسی طرح اگر اس مسافر کا مال نصاب سے کم ہو تو اس وقت بھی وہ کسٹم ڈیوٹی نہیں لے گا اگر چہ یہ شخص ڈیوٹی دینے پر مصر ہو اور کہتا ہو کہ اس کے گھر میں مال بقدر نصاب موجود ہے۔

صاحب درمختار نے اس کی جو توجیہہ کی ہے ذرا وہ بھی سن لیجیے فرماتے ہیں:

لانہ ظلم ولا متابعة عليه[1]۔

غیر مسلم حکومت میں مسلمان سوداگر کے پورے مال کے ہتھیائے جانے کے باوجود اسلامی حکومت میں غیر مسلم مسافر کے پورے مال پر بطور جوابی کارروائی کے قبضہ نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ ایسا کرنا ظلم ہے اور پیروی ظلم میں نہیں ہوتی ہے۔

اس کے برعکس اگر غیر مسلم حکومت میں مسلمان تاجر سے ڈیوٹی بالکل نہ لی جاتی ہو تو اسلامی حکومت اس کے جواب میں غیر مسلم سوداگر سے بھی کچھ نہ لے گی خواہ اس کا مال کتنا ہی زیادہ ہو، اس کی وجہ کیا ہے؟ صاحب درمختار لکھتے ہیں:

ليستمروا عليه ولانا احق بالمكارم[2]۔

ہم ایسا اس لیے کریں گے تاکہ غیر مسلم حکومت مسلمان تاجروں کے ساتھ اس اچھے معاملہ کو جاری رکھے اور پھر حمیدہ اخلاق تو ہم کو بدرجۂ اولیٰ دکھانے چاہئیں۔

جو لوگ بات بات میں انتقام انتقام کا نعرہ لگانے کے خوگر ہیں انھیں دل کی آنکھ کھول کر ان تعلیمات کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ اسلام کس طرح ہر حالت میں عدل وانصاف کے بلند مقام سے نیچے نہیں اترتا۔

---

[1] درمختار ج ۲ ص ۵۶۔

[2] ایضاً

سطور بالا میں جو کچھ آپ نے پڑھا ہے اس کی روشنی میں اب یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ :

(۱) پاکستان کا قیام چونکہ ہندو مسلم سمجھوتہ سے ہوا ہے اور اس مفاہمت کے ساتھ ہوا ہے کہ پاکستان کی اقلیت کو وہاں کے مسلمانوں کے برابر شہری حقوق ملیں گے۔ اس بنا پر اسلامی حکومت ہونے کا ہی تقاضا یہ ہے کہ ان لوگوں کو مساوی درجہ کے شہری حقوق دیے جائیں اور اس بارہ میں مسلم و غیر مسلم کا کوئی فرق و امتیاز نہ برتا جائے۔

(۲) اگر قیام پاکستان اس سمجھوتہ کے ساتھ نہ بھی ہوتا تب بھی چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کو برابر کے شہری حقوق حاصل ہیں، اس بناء پر پاکستان گورنمنٹ کا یہ اسلامی فرض تھا کہ وہ بھارت کے مسلمانوں کی خاطر اپنے ہاں کی غیر مسلم اقلیت کو یہ حقوق و مراعات دے۔

دہلی سلطنت میں غیر مسلموں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ:

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے پاکستان کا قیام تو باہمی سمجھوتہ اور آپس کے معاہدہ کے ساتھ ہوا ہے یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ مسلمانوں نے جس ملک کو بزور شمشیر فتح کیا تھا انھوں نے اس میں بھی غیر مسلموں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا ہے۔ پوری تاریخ کو چھوڑ دیجیے اور ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں سے بھی عہد مغلیہ پر صرف نظر کر لیجیے کہ مغلوں کا جو معاملہ رہا ہے سوائے اورنگ رحمۃ اللہ علیہ کے اور کسی بادشاہ سے ہندوؤں کو بھی شکایت نہیں رہی۔ صرف دہلی سلطنت کو لیجیے اس سلطنت کا معاملہ یہاں کے ہندوؤں کے ساتھ یہ تھا کہ معز الدین کیقباد نے حکومت کے طلائی سکہ تک پر ہندو دیبی کی تصویر نقش کرا رکھی تھی[1] برہمنوں اور مندروں کے پجاریوں کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور ان کو ٹیکس سے آزاد رکھا گیا تھا، ہندوؤں کی غیر انسانی رسم یعنی ستی تک کو ایک مذہبی رسم ہونے کی وجہ سے باقی رہنے دیا گیا تھا۔

(1) The foundation of muslim rule in India. p. 300.

مذہبی آزادی کا یہ عالم تھا کہ فیروز خلجی خود اس کا اقرار کرتا ہے کہ ہر روز ہندو میرے محل کے نیچے سے سنکھ اور گھنٹی بجاتے ہوئے گزرتے ہیں تاکہ جمنا کے کنارہ پہنچ کر اپنے بتوں کی پوجا کریں۔ میں اسلام کا محافظ ہوں لیکن اس کے باوصف یہ لوگ ڈھول پیٹتے ہیں، گاتے بجاتے ہیں، مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں اور خود میرے دارالسلطنت میں مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ شان و شوکت اور طمطراق سے رہتے ہیں ان کو مکمل آزادی ملی ہوئی ہے[1]۔ دہلی کے پرانے قلعے سے ایک کتبہ جو فارسی اور سنسکرت میں لکھا ہوا ہے دستیاب ہوا تھا اس سے ثابت ہوتا تھا کہ بارہ بیگہ زمین حکومت کی طرف سے ایک مندر کے لیے عطا کی گئی تھی جو سری کرشن کے نام پر نیا نیا تعمیر ہوا تھا[2]۔

اس سلطنت میں ہندوؤں کی معاشی اور اقتصادی خوشحالی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ برنی کو شکایت ہے کہ خاص دہلی شہر میں ہندو بڑے بڑے شان دار محلات میں رہتے ہیں، اعلیٰ قسم کے کپڑے پہنتے ہیں۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر طمطراق سے نکلتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے مسلمان نوکر اُن کے گھوڑوں کے آگے دوڑے دوڑے چلتے ہیں۔ ان ہندوؤں کو جب مسلمان خطاب کرتے ہیں تو راے۔ رانا۔ ٹھاکر۔ شاہ۔ مہتا اور پنڈت وغیرہ ایسے باعزت القاب و آداب سے مخاطب کرتے ہیں۔

آخری گزارش:

آخر میں یہ گزارش اور کرنی ہے کہ ہمارے بعض ہندو دوست کہتے ہیں کہ پاکستان گورنمنٹ جب تک اسلامی حکومت رہے گی، اور سیکولر گورنمنٹ نہیں بنے گی وہاں کی اقلیت میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہو سکتی، عرض یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا جب تک عنوان قائم رہے گا وہاں کی گورنمنٹ اور عوام پر خدا تعالیٰ کا خوف اور مذہب کا پاس غالب رہے گا، اور اس بنا پر وہ اقلیت کے ساتھ مساویانہ برتاؤ اپنا مذہبی فرض سمجھ کر کریں گے۔ اس کے برخلاف سیکولر گورنمنٹ ہونے کی شکل میں جب تک عوام انتہائی شائستہ نہ ہوں خاطر خواہ نتائج کی امید نہیں ہو سکتی۔

(برہان، دہلی، مئی ۱۹۵۰ء)

---

[1] ضیاء الدین برنی ص ۲۱۷ — [2] مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے:
The foundation of muslims rule in India. pp. 298-300

اسلامی جمہوریۂ پاکستان

(تاریخ کا ایک اہم واقعہ)

گزشتہ مہینہ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ۲۳ رمارچ کو ہمارے پڑوس میں "اسلامی جمہوریۂ پاکستان" قائم ہوگیا۔ جمہوریہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہاں حکومت کسی خاص ایک طبقہ یا گروہ کی نہیں ہوگی بلکہ سب اہلِ ملک کی ہوگی اور ملک کے ہر باشندہ کو بلاتفریق مذہب و ملت یکساں شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ کسی کو کسی پر کوئی تفوق نہ ہوگا۔ اور قانون کی نگاہ میں سب کی حیثیت یکساں اور برابر ہوگی۔ اس جمہوریہ کو "اسلامی" کی صفت سے موصوف کرنے کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان کی گورنمنٹ اور وہاں کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرلیا ہے اور اس بات کا اقرار کیا ہے کہ وہ اپنے ہر قول و عمل کے لیے خدا تعالیٰ کے سامنے جواب دہ اور مسئول ہیں۔ اور ان کا جو قدم بھی اٹھے گا وہ اسی تصور اور اسی یقین کے ماتحت اٹھے گا۔

ایک جمہوریہ میں حکومت عوام کی ہوتی ہے اور عوام کے لیے ہوتی ہے وہ خود اپنی صواب دید سے ایک دستور بناتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کا عہد و پیمان کرتے ہیں، لیکن انسان جس طرح اپنی انفرادی زندگی میں اپنی خواہشات اور جذبات سے یکسر بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اپنی جماعتی زندگی میں بھی وہ جماعتی عصبیت سے یکسر الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور اس بنا پر کوئی کام خواہ کتنی ہی نیک نیتی اور ایمان داری سے کیا جائے، اس میں بہرحال غلطی اور نقص کا احتمال رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریتیں ایک مرتبہ اپنا دستور بنانے کے بعد اس میں وقتاً فوقتاً ترمیم و تنسیخ اور ردوبدل کرتی رہتی ہیں۔ لیکن جو خدا تعالیٰ

کا قانون ہے اس میں کوئی ردو بدل نہیں ہو سکتا اس کے علاوہ اپنے ہر عمل کے لیے خدا تعالیٰ کے سامنے جواب دہ سمجھنے اور یقین کرنے کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے عمل میں زیادہ خلوص جوش اور استواری پیدا ہو جاتی ہے اور زندگی کے متعلق اس کا نقطۂ نظر زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایک اسلامی جمہوریہ صحیح معنی میں اسلامی جمہوریہ ہو تو وہ اپنوں کے لیے بھی رحمت ہے اور پرایوں کے لیے بھی۔

اسلام کا بنیادی اصول زندگی یہ ہے کہ خود اپنے ساتھ انصاف کرو اور دوسروں کے ساتھ انصاف کرو۔ دنیا میں جب کبھی اور جہاں کہیں اس اصول پر عمل کیا گیا ہے زندگی باغ و بہار بن گئی ہے، اور جب کبھی اس سے انحراف ہوا تو جس درجہ کا انحراف تھا اسی درجہ کی تباہی اور بربادی آئی ہے۔ اسلامی تصورِ حیات کے ماتحت ایک شخص یہ عقیدہ رکھنے پر مجبور ہے کہ اگر اس نے خدا تعالیٰ کے کسی بندہ کے ساتھ ناانصافی کی یا اس کی حق تلفی کی ہے تو اگرچہ اس کی دولت و ثروت اور طاقت و قوت کی وجہ سے یہاں کی حکومت اور قانون، عدالت اور پولیس اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے لیکن بحکم "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ خدائے احکم الحاکمین کو وہ کوئی جُل نہ دے سکے گا اور اس کی پکڑ سے بچ کر کہیں پناہ نہ لے سکے گا۔ اسی تصورِ حیات اور اس کے پس منظر میں اسی عقیدۂ یومِ آخرت کا یہ اثر تھا کہ محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق جیسے باجاہ و جلال بادشاہوں نے معمولی حیثیت کے ہندوؤں کے استغاثہ پر اپنے آپ کو بے تکلف قاضی کی عدالت میں جواب دہی کے لیے پیش کر دیا اور قاضی کا فیصلہ ایک معمولی حیثیت کے انسان کی طرح بصد رضا و رغبت سنا اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے، اور یہ ایک دو نہیں تاریخ میں اس طرح کے سیکڑوں واقعات ملیں گے۔

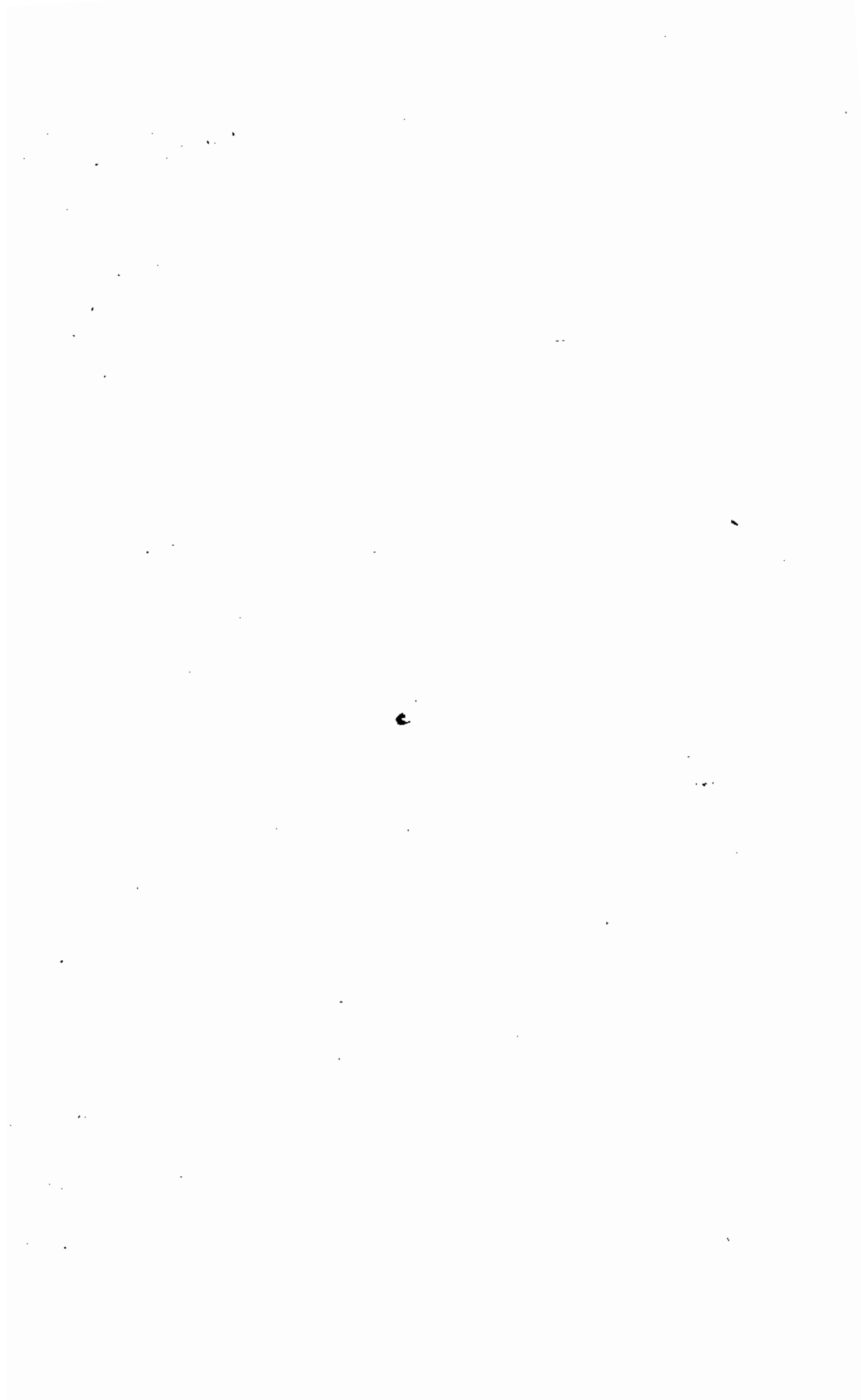
اسلامی جمہوریہ ہونے کی بنا پر پاکستان کی اقلیتیں پاکستان گورنمنٹ اور یہاں

کی اکثریت کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ کی ایک امانت ہیں، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد " وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ" کے مطابق ان کا یہ فرض ہے کہ ان اقلیتوں کے ساتھ صرف مساوات اور برابری کا نہیں، بلکہ ایثار۔ فیاضی اور کشادہ دلی کا معاملہ کریں۔ اسلام میں تالیف قلب کی بڑی اہمیت ہے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مؤلفۃ القلوب کو عام مسلمانوں سے زیادہ حصّہ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ غزوۂ حنین کے موقع پر انصارِ مدینہ کو اس پر کچھ شکایت ہوئی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت غضب ناک ہوکر ایک تقریر کی اور اس میں آپ نے فرمایا کہ اے انصار تم تو مسلمان ہو۔ اسی لیے ہیں نے تم کو اسلام کے حوالے کر دیا ہے۔ رہے یہ لوگ تو میں ان کی تالیفِ قلب (دل جوئی) کرتا ہوں۔ تم اس پر کیوں بُرا مانتے ہو۔

بہر حال پاکستان نے اپنے متعلق " اسلامی جمہوریہ" کا اعلان کر کے ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لی ہے، آئندہ تاریخ بتائے گی کہ پاکستان نے اس اعلان کے ذریعہ اسلام کی آزمائش اور جانچ کا جو موقع دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس میں کہاں تک وہ اپنے حسن عمل و کردار سے اسلام کو نیک نام ثابت کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

ہماری دلی دعا ہے کہ ہمارا یہ پڑوسی ملک صحیح معنیٰ میں اسلامی جمہوریہ ہو، اور وہ اپنے عمل اور حسنِ اخلاق و بلند کردار کا ایسا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے جو خدا ناشناس جمہوریتوں کے لیے لائق تقلید ہو، اور جس سے دنیا میں انسانیت نوازی، شرافت و حریت اور امن پسندی و صلح گستری کی اعلیٰ مثال قائم ہو۔

(برہان، دہلی۔ اپریل ۱۹۵۶ء)



ہندوستان اور پاکستان
(نہرو لیاقت معاہدے کی روشنی میں)

نہرو لیاقت معاہدہ کے بعد سے اب تک اگرچہ بھارت اور پاکستان میں کہیں کوئی بڑا واقعہ سننے میں نہیں آیا اور اس معاہدے کے بہت سے خوش گوار نتائج کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ کہنا دوپہر کے چمکتے سورج سے انکار کرنا ہوگا کہ اس سے دونوں ملکوں کی اقلیت میں اطمینان و اعتماد پیدا ہو گیا ہے، اور اب ان میں خوف وہراس یا مستقبل کی طرف سے بے چینی و مایوسی کا احساس نہیں رہا ہے جیسا کہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے، دونوں ملکوں میں آمدورفت کا سلسلہ برابر جاری ہے، کسی دن آنے والے کم ہوتے ہیں اور کسی دن جانے والے اور یہ تعداد سیکڑوں کی نہیں بلکہ روزانہ ہزاروں تک کی ہوتی ہے، پھر اس بات کو بھی فراموش نہ کیجیے کہ اب جو ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں اقلیتی فرقے کے لوگ پہنچ رہے ہیں وہ ہنگامی حالات کی وجہ سے ایسا نہیں کر رہے ہیں کیوں کہ اب یہ ہنگامی حالات ہیں ہی نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر اور آخری فیصلہ کر کے بلکہ ان میں بہت سے وہ ہوں گے جنھوں نے دوسرے ملک میں جہاں وہ آرہے ہیں پہلے سے اپنی رہایش اور معاش کا انتظام کر لیا ہوگا، اس بناء پر زمانۂ امن میں اقلیت کی ایک ملک سے دوسرے ملک میں حرکت زمانۂ فساد کی نقل وحرکت سے بھی کہیں زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز ہے، اور اگر دن رات یہی رہے تو دونوں حکومتیں مانیں یا نہ مانیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عملاً خود بخود آبادی کا تبادلہ ہو جائے گا۔ اور دونوں ملک دو مستقل دشمن کیمپوں میں منتقل ہو جائیں گے۔

خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو لیکن اگر ایسا ہوا تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس چھوٹے سے

برّاعظم کا حشر وہی نہ ہوگا جو آج کوریا کا ہو رہا ہے۔ یہ ملک بھی ایک ہی تھا جنگ عظیم دوم کے اثرات نے اس کو جنوبی کوریا اور شمالی کوریا کے دو حصوں میں تقسیم کردیا تقسیم کا طبعی نتیجہ منافرت و عداوت باہمی ہونا ہی تھا چنانچہ ملک کے دونوں منقسم حصوں کے لوگوں میں بدمزگی، تلخی اور دشمنی پیدا ہو جانے کی وجہ سے آئے دن جھڑپیں ہونے لگیں، اور شدہ شدہ ان کا یہ انجام ہوا کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے میدانِ جنگ میں دست و گریباں ہوگئے، اب سوچیے کہ بھلا کس کا ہوا؟ تو واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بھلا کسی کا بھی نہیں ہوا بلکہ دونوں نے اپنے اوپر تباہی اور بربادی کو مسلط کر دیا ہے۔ جیت اگر ہوگی تو روس کی یا امریکہ کی ہوگی۔ کوریا کا حال تو یہ ہے کہ ایک مہینہ کے اندر اندر پچاس لاکھ سے زائد انسان گھر سے بے گھر ہو کر ایک وقت کی روٹی تک کو محتاج ہو گئے ہیں، ہزاروں خاندان بے چشم و چراغ ہو گئے صنعتی و حرفتی ادارے دم کے دم میں کھنڈر بن گئے، اور ہری بھری آبادیاں چشم زدن میں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں پس جو اسباب کوریا کی تباہی کے تھے وہی ہندوستان میں پیدا ہو رہے ہیں، اور جن ہاتھوں نے لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دے کر ایک دوزخ بنا دیا وہی ہاتھ یہاں بھی مصروف عمل ہیں۔

نہرو لیاقت معاہدہ جس جذبۂ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے اچھا ہونے میں کلام نہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اگر بھارت اور پاکستان کی حکومتیں فرض شناس اور ساتھ ساتھ مطالبات فرض کی عملی تکمیل و تعمیل میں جری و بے باک ہوتیں تو اس معاہدہ کی چنداں ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ اعلانِ دوستی کے مطابق ہندو پاکستان کا اور مسلمان بھارت کا شہری ہے، اور اس بنا پر ہر حکومت کا فرض ہے کہ قطع نظر اس سے کہ دوسرے ملک میں کیا ہو رہا ہے وہ اپنے ملک کے شہریوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے اگر ذرا باریک نگاہی سے غور کیجیے تو صاف معلوم ہوگا یہ معاہدۂ دہلی اس بات کی نشانی اور اس حقیقت کا کھلا ہوا اقرار ہے کہ

دونوں حکومتیں بحیثیت حکومت کے اپنا فرض ادا کرنے میں قاصر رہی ہیں، اور اس لیے معاہدہ کی آڑ لے کر دونوں اپنے اپنے گناہوں کو چھپانا چاہتی ہیں، دو شخص ایک گناہ میں شریک ہو کر جس طرح ایک دوسرے کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ اسی طرح ان دونوں حکومتوں نے بالواسطہ اقرارِ جرم کر کے اپنے جرم کے لیے ایک عذر پیدا کیا ہے۔

اس طرح خونِ ناحق کا تیز رنگ دونوں حکومتوں کے دامن پر پھیکا ہوا یا نہیں یہ تو تاریخ کی عدالت بتائے گی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ دونوں ملکوں کی اقلیتوں کی بے اعتمادی و بے چینی کے اسباب قطعاً نفسیاتی ہیں اور جب تک ان کا تدارک نہیں کیا جائے گا اعتماد بحال نہیں ہو سکتا، ان اسباب کا تدارک اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا اور جس کا بار بار اعلان کیا گیا ہے، ایمانداری اور پوری سچائی کے ساتھ اس پر عمل بھی کیا جائے اور دلوں کو صاف اور دماغ کو پاک کر کے ٹوٹتے ہوئے دلوں کو پھر سے جوڑنے کی مخلصانہ جدو جہد کی جائے جہاں تک اس عمل اور اس کی ضرورت کا تعلق ہے دونوں حکومتوں کا فرض یکساں اور برابر ہے، لیکن ہمارے نزدیک پاکستان کا فرض اور اس معاملہ میں اس کی ذمہ داریاں بہ نسبت بھارت کے اور بھی کہیں زیادہ ہیں اور اس کے وجوہ یہ ہیں:

(۱) ہندوستان کی تقسیم ارباب پاکستان کے مطالبہ اور ان کے اصرار پر ہوئی ہے، اس لیے تقسیم سے جو خرابیاں، بدمزگیاں اور تلخیاں پیدا ہو گئی ہیں پاکستان کا فرض اولین ہے کہ وہ ان کا تدارک اور ان کی اصلاح کرے۔

(۲) پاکستان میں ہندو صرف ایک کروڑ ہیں لیکن بھارت میں مسلمانوں کی تعداد ۳½ کروڑ ہے، اگر ایک کروڑ وہاں برباد ہوئے تو یہاں ان سے ساڑھے تین گنا زیادہ برباد ہو جائیں گے۔

(۳) بھارت ایک وسیع اور زرخیز و آباد ملک ہے، اس لیے ہندوؤں کو بھارت

میں آکر آباد ہونا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے، جتنا کہ بھارت کے مسلمانوں کا پاکستان میں پہنچ کر آباد ہونا۔

(۴) پاکستان کو اسلامی حکومت کہا گیا ہے، اس لیے ہندوؤں کا اس سے بد دل ہونا اور خصوصاً مغربی پنجاب وغیرہ کے مظالم کے بعد۔ ایک بالکل نفسیاتی چیز ہے۔ اسلام بے شبہ ایک مکمل نظام عدل و انصاف ہے، لیکن ایک غیر مسلم کے دل میں اس حقیقت کا اعتراف آپ اپنے عمل ہی سے جاگزیں کر سکتے ہیں۔

(۵) پاکستان کی تعمیر و قیام میں بھارت کے مسلمانوں کا بہت بڑا دخل ہے، اس لیے پاکستان کا شرعی، اخلاقی اور انسانی فرض ہے کہ اگر کچھ اور نہیں تو کم از کم اس حق کی منت شناسی کے طور پر ہی وہ اپنے ہاں کے ہندوؤں کی ہر طرح دلجوئی کرے۔

(۶) پاکستان نے اپنے آپ کو اسلامی حکومت کہا ہے، اس لیے اب اگر پاکستان میں کوئی جبر، ظلم یا نا انصافی کا واقعہ پیش آتا ہے تو اس سے اللہ، اللہ کے رسول، دین حق کی بدنامی اور رسوائی ہوتی ہے، اور یہ اتنا بڑا گناہ ہے جس کی پاداش کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

کہتے ہیں بدی سے بدی پیدا ہوتی ہے، اگر یہ سچ ہے تو اس سے کہیں زیادہ سچ یہ ہے کہ نیکی سے نیکی پیدا ہوتی ہے، پہلی چیز کا تجربہ کرتے ہوئے تین سال بیت گئے تو کیا اب ایک عظیم الشان اور نہایت ہولناک عالمگیر طوفانِ انقلاب کی آمد سے پہلے اپنی یک جائی حفاظت کے لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ دونوں حکومتیں نیکی سے نیکی کا بھی تجربہ کر دیکھیں۔

(برہان، دہلی۔ اگست ۱۹۵۰ء)

باب ہشتم

پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت

(از جناب مولانا سید محمد میاں صاحب مراد آبادی ناظم جمعیۃ علماء ہند)

"ذیل میں ہم اپنے فاضل و محترم دوست جناب مولانا کا وہ خط شائع کرتے ہیں جو موصوف نے برہان کے گذشتہ مقالہ "پاکستان گورنمنٹ کی اسلامی حیثیت" کو ملاحظہ فرمانے کے بعد تحریر فرمایا ہے۔ مولانا کی علمی اور دینی بصیرت و تفقہ کسی تعارف کی محتاج نہیں، اس لیے اس خط میں جو چند نقاط زیر بحث لائے گئے ہیں وہ کافی غور طلب ہیں مگر افسوس ہے کہ یہ خط اس وقت ملا جب کہ مکتوب الیہ بیماری کے باعث صاحب فراش ہے اس لیے نہ اس کا جواب لکھا جا سکا اور نہ برہان کے لیے وہ مقالہ ہی تیار ہو سکا جس کو اس اشاعت میں آنا تھا بشرط صحت آیندہ اشاعت میں اس کی تلافی کی جائے گی۔" (ایڈیٹر)

محترم مولانا۔ دامت فیوضکم دعمت السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔

جناب کا مضمون میں نے کل ہوائی جہاز کی فرصت میں مطالعہ کیا۔

محترم مولانا۔ آپ نے اس مضمون سے اہل علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ غور وفکر کی ایک سبیل معین کر دی۔ بہت سی جزئیات کے لیے ایک صحیح اصول پیش کر دیا۔

اسلامی حکومت کی تعریف کر کے درحقیقت نواب زادہ لیاقت علی خاں اور ان کی پارٹی پر بھی بہت بڑا احسان ہو گیا شاید یہ توجیہہ ان کے سامنے بھی اس انداز سے نہ ہو گی۔ اسی طرح ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کا بھی جواب دیا جا سکتا ہے۔ تقسیم کے وقت

اگر کوئی معاہدہ نہ بھی ہوا ہو تو نہرو لیاقت معاہدہ نے اقلیت کے آئینی اور دستوری
حقوق پاکستان پر لازم کر دیے لیکن آپ کے مضمون کے مطالعہ سے ایک شبہ بھی پیدا
ہو سکتا ہے اور میری طرح خیال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو ہوا ہوگا۔ آپ کے مضمون
سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان بحالت موجودہ اس بنا پر کہ جمعہ اور عیدین کی اجازت
ہے، اور مسلمانوں کی شہری اور قومی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے، دارالاسلام ہے حالانکہ
جس عبارت سے آپ استدلال کر رہے ہیں اس میں سخت حکم ولاۃ امورنا موجود
ہے۔

اس فقرہ کا جو ترجمہ آپ نے کیا ہے وہ بھی خلجان میں اضافہ ہی کر دیتا ہے۔ درمختار
وغیرہ کی بہت سی عبارتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے، اور اکابر علماء کے فیصلوں سے بھی
یہ ہی ثابت ہے کہ جب تک مذہبی امور میں مسلمانوں کا با اختیار نظام نہ ہو۔ دارالاسلام
نہیں ہے، اور اگر کسی ملک میں یہ با اختیار نظام نہ ہو تو اس کا قایم کرنا ضروری ہے
اور اسی بناء پر درمختار میں غالباً باب قضاء میں یہ ہے کہ مسلمانوں پر واجب ہوتا ہے
کہ وہ اپنا ایسا امیر بنائیں جو جمعہ قائم کر سکے اور نکاح وغیرہ کے معاملات انجام دے
سکے۔

حضرت مولانا سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تمام عمر اسی مسئلہ کو پیش کرتے رہے اور
جمیعۃ علماء ہند کا مطالبہ نظام قضاء جس کو غالباً کلچرل اٹانمی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے،
وہ بھی یہی ہے۔

علاوہ ازیں مسلمان حکام اور نمازوں کی آزادی انگریزی دور میں بھی تھی مگر اس زمانہ
میں علماء نے ہندوستان کو دارالاسلام نہیں کہا۔ البتہ بھوپال اور حیدرآباد کو درمختار
کی اس عبارت کے بموجب دارالاسلام تسلیم کرتے رہے۔

گویا۔ دارالاسلام کے لیے یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کے ہاتھ میں
ہو۔ البتہ اگر کسی ملک میں مسلمانوں کے اندرونی معاملات ان کے ولاۃ امور کے اپنے
حوالے کر دیے گئے ہیں تو وہ دارالاسلام ہو جائے گا۔ ایسی صورت کے بعد موجودہ

ہندوستان کی حیثیت کا سوال پھر باقی رہ گیا، دارالحرب یقیناً نہیں ہے کیونکہ اقتدار اعلیٰ محارب نہیں۔ مکہ کی مثال بھی صادق نہیں آتی، اور مدینہ طیبہ کے ابتدائی دور میں اگرچہ مسلمانوں اور یہودیوں کو ملاکر سیاسی وحدت قائم کر دی گئی تھی۔ مگر عدالت عالیہ۔ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل و انصاف تھا۔ اور اسی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے سپرد تھا۔

حبشہ میں مسلمان۔ مستامن تھے۔ پناہ گزین تھے۔ حبشہ کو وطن نہیں بنایا اور اس دور پناہ گزینی میں جو حبشہ نے امداد کی اس کے عوض میں مسلمانوں نے بھی جنگ میں شاہ حبشہ کی فوجوں کی امداد کی بموجب " ھل جزاء الاحسان الا الاحسان "

لہذا حبشہ پر بھی ہندوستان کو قیاس نہیں کر سکتے۔

اب ایک اہم خدمت یہ ہے کہ آپ ہندوستان کی حیثیت معین کریں، کتب فقہ میں دو ہی " دار " کا تذکرہ آتا ہے، دارالاسلام اور دارالحرب لیکن قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ اور بھی ہوں۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خطبۂ صدارت جمعیۃ علماء ہند میں غالباً " الدر المنتقیٰ " کے حوالہ سے ایک تیسرا دار بھی بیان فرمایا ہے یعنی دارالامن لیکن یہ کتاب مجھے ملی نہیں۔ اس کتاب کا صحیح نام تو خطبہ صدارت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اگر جناب کے پاس نہ ہو تو احقر دہلی پہنچ کر لکھ دے گا مگر بہرحال یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس کا فیصلہ کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ دو باتیں اور بھی عرض کر دوں۔ ان دونوں سے احقر کو مسرت ہوئی۔ کیونکہ آج تک ان دونوں خیالات میں کسی کی تائید نہیں حاصل ہوئی تھی، آپ کی تحریر سے تائید حاصل ہو گئی۔

اوّل یہ کہ خلافت راشدہ خیر القرون سے اس لیے آگے نہیں بڑھ سکی کہ ایسے آدمی نہیں رہے تھے، احقر کا خیال بھی یہی ہے۔

بظاہر خلافت راشدہ کے لیے ضرورت ہے کہ اس کے تمام ذمہ دار تقویٰ اور عبادت کے تربیت یافتہ اور صاحب بصیرت و تفقہ ہوں۔

سیدالانبیاء صلے اللہ علیہ وسلّم کے فیض صحبت نے جن کی تربیت کی تھی ان کا ایسا دَور جس میں اقتدار اعلیٰ ان کے ہاتھ میں ہوتا وہ کم وبیش تیس۳۰ سال تک رہنے والا تھا۔ سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بھی منکشف ہوچکی تھی، آپ کے بعد دیانت و امانت کی ترقی نہ ہوگی بلکہ تدریجی تنزل شروع ہو جائے گا۔ لہٰذا آپ کا یہ ارشاد کہ میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی پھر ملک عضوض شروع ہو جائے گا ایک ایسی پیشین گوئی ہے جو طبعی حالات کے قیاس پر مبنی ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا یہ فیصلہ ہر ایک غلجان کو ختم کر دیتا ہے کہ قرون ثلاثہ مشہود لہا بالخیر۔ حضرت عثمان غنی رضی عنہ کی شہادت پر ختم ہو جاتے ہیں، البتہ حضرت شاہ صاحبؒ بے شمار احادیث کی روشنی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کو بھی خلافت راشدہ ہی قرار دیتے ہیں البتہ خلافت راشدہ غیر منتظمہ۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات کے مطابق خیر القرون کے علی الترتیب یہ تین درجے ہوتے ہیں۔

۱۔ دَور نبوت۔

۲۔ خلافت راشدہ علیٰ منہاج النبوت۔

۳۔ خلافت راشدہ منتظمہ :۔ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ختم ہوتا ہے۔

لیکن آپ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دَور کے بعد، امامت، خلافت یا دینی حکومت صحیح معنی میں کبھی قائم نہیں ہوئی۔ ابتدائی دَور کے ساتھ تحدید پر مجھے شبہ ہے۔

دوسری بات جس سے مجھے اطمینان ہوا۔ کہ آپ سے اس کی تائید حاصل ہوئی۔ وہ یہ کہ ستی کی رسم جو مسلمان بادشاہوں کے دَور میں جاری رہی تو اس کا سبب مسلم حکام کی بے پرواہی اور بے اعتدالی نہیں تھی بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کے رسم ورواج میں مداخلت کبھی بھی گوارا نہیں کی اگرچہ

احقر کے خیال میں اصولاً اُن کے لیے لازم تھا کہ وہ اس رسم کو بند کرتے۔ کیوں کہ یہ ایسا فعل ہے جو نہ صرف اسلام کی رو سے ناجائز ہے بلکہ اقوام عالم کے مسلمات کے خلاف ہے، اور جس طرح نکاح وغیرہ کے سلسلہ میں آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی اجازت نہ ہوگی کہ مجوسی - ماں یا حقیقی بہن سے شادی کر سکے، اسی طرح ستی کی رسم بھی تھی۔ تاہم اگر اس کو ختم نہیں کیا گیا تو اس کا باعث ان کا یہی تخیل تھا کہ ہندوؤں کی مذہبی آزادی میں کوئی مداخلت نہ ہونی چاہیے۔

میں نے کافی وقت لے لیا۔ اور اپنا بھی اتنا ہی وقت صرف کر دیا مگر میرا خیال ہے کہ اس طویل تحریر میں جس تحقیق کی آپ سے درخواست کی ہے اگر وہ منظور ہوئی تو مجھے بھی فائدہ ہوگا اور عام مسلمانوں کو بھی۔ محترم مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی خدمت میں سلام پیش فرما دیجیے۔ بچوں کو دُعا فرما دیجیے۔

(برہان، دہلی۔ جون ۱۹۵۰ء)

آزاد ہندوستان کا دستور اور مذہبی آزادی

" یہ امر قابل اطمینان ہے کہ کانگریس اپنے اصولوں اور نظریات پر قائم رہی ۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک کا دستور جمہوریت اور نامذہبی اصولوں پر وضع کیا گیا ۔ یہ دستور ہندوستان کے ہر باشندے کو مساوی حیثیت دیتا ہے اور بلا اختلاف مذہب وملت ہر ایک ہندوستانی کے لیے ترقی کے دروازے کھلے رکھتا ہے اور ہر طبقہ کو موقع دیتا ہے کہ وہ بقاو تحفظ وترقی کے راستے سوچے اور آزادی کے ساتھ ان پر عمل کرے ۔ مگر اسی کے ساتھ ہمارا فرض ہے کہ پوری مستعدی کے ساتھ ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآہوں ، جو اس سلسلے میں ہمارے اوپر عائد ہوتی ہیں ۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان باتوں پر غور کریں کہ ملی اور اجتماعی فرائض کیا ہیں اور ہم کس طرح اپنے مذہب ، مذہبی علوم ، اسلامی تہذیب ، اپنے مآثر ومعابد اور اپنے اوقاف کی حفاظت کر سکتے ہیں اور کس طرح ملک کی تعمیر جدید میں اپنی اسلامی تہذیب وثقافت کی حفاظت وترقی کے ساتھ حصہ لے سکتے ہیں

(خطبہ صدارت جمعیتہ علماء ہند ، حیدر آباد ، ۱۹۵۱ء)

ضمیمه جات

ہندوستان کی حیثیت

مولانا سید محمد میاں

مولانا سید محمد میاں علیہ الرحمہ نے "علماءِ حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" حصہ اوّل میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مسلکِ سیاسی کی وضاحت کے سلسلے میں جو نہایت مفید بحث فرمائی ہے۔ اس میں چند سوالات کے جوابات میں ہندوستان کی شرعی حیثیت بھی موضوع بنی ہے۔ یہ بحث اگرچہ بہت مجمل ہے لیکن بہت اہم ہے اور دیوبندی مکتبہ فکر کی انقلابی جماعت کے خیالات کی صحیح ترجمانی اس مختصر تحریر سے ہوتی ہے۔ یہ تحریر اسی کتاب سے مقتبس ہے۔

سوالات:

(۱) ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام؟

(۲) کیا انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی جدوجہد ضروری ہے؟

(۳) آزادئ وطن کی کیا صورت ہو؟

(۴) جانشینانِ ولی اللہ نے آزادی کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟

(۵) کیا وطنی مطالبات اور ملکی مفاد کے لیے ہندوؤں کے ساتھ کانگریس میں شرکت جائز ہے؟

جوابات:

نمبر ۱: سو سال کامل گزر گئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ صاف اور صریح الفاظ میں دے چکے، جہاد کا لائحہ عمل بنا چکے۔

تحریک حضرت سید صاحبؒ کا تمام ہنگامہ برپا ہوا۔

ملت اسلامیہ کے ہزاروں عزیز نوجوان شہید ہوئے، سیکڑوں خاندانوں کے

چراغ گل ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کا خونی معرکہ ہندوستان کے چپہ چپہ کو خونِ شہداء سے رنگین کر چکا۔ ہزاروں نوجوان توپوں کے لقمے بنا دیے گئے۔ لاکھوں درخت وحشت ناک پھانسیوں کا نظارہ دیکھ چکے۔

یہ سب کچھ ہو چکا مگر انگریزی فتنہ اور یوروپین دغل وفریب کا یہ اثر تھا کہ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے متعلق اب بھی شبہ تھا۔

چنانچہ مولانا سعدالدین صاحب کشمیری اور مولانا امان اللہ صاحب کشمیری نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے متعلق حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز سے استفتاء کیا۔

جس کے جواب میں حضرت امام ربانی نے نہایت مبسوط اور مدلل فتویٰ فارسی زبان میں تحریر فرمایا۔ جس کی اشاعت کانگریسی وزارتوں سے پہلے ناممکن رہی، اور جیسے ہی (۱۹۳۷ء میں) کانگریس وزارت قائم ہوئی تو بازار کی چلنے والی چیز تصور کرکے اس کو ایسے بزرگ نے شائع فرمایا جن کا مسلک اس فتوے کے خلاف ہے، اور پھر آخر میں شمس الہدیٰ پٹنہ کے سابق پرنسپل نے ایک صفحہ کا بے معنی فتویٰ لگا کر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا دیا۔

امام ربانی رح سات صفحہ کی مفصل اور مدلل تحریر کے بعد بطور نتیجہ فرماتے ہیں:

اکنوں حال ہند را خود غور فرمائند کہ اجرائے احکام کفار نصاریٰ دریں جا بچہ قوت وغلبہ ہست۔ اگر ادنیٰ کلکٹر حکم کند کہ در مساجد جماعت ادا نکنید۔ ہیچ کس از امیر وغریب قدرت ندارد کہ ادائے آں نماید۔

اب ہندوستان کی حالت پہ آپ خود غور فرمائیے کہ اس جگہ کفار ونصاریٰ کے احکام کا اجرا کس قوت اور غلبہ کے ساتھ ہے اگر ایک ادنیٰ کلکٹر حکم کردے کہ مسجدوں میں جماعت نہ ادا کریں تو کسی بھی امیر یا غریب کی مجال نہیں ہے کہ مسجد میں جماعت ادا کر سکے۔

چند سطور کے بعد فرماتے ہیں:

بہر حال تسلط کفار بر ہند بدایں درجہ است کہ در ہیچ وقت کفار دار حرب زیادہ ازیں نبود۔ و ادائے مراسم اسلام از مسلمانان محض باجازت ایشان است و از مسلمان عاجز ترین رعایا کسے نیست ہنود را ہم رسوخ ست مسلمانان را نیست۔

بہر حال کفار کا تسلط ہندوستان پر اس درجہ ہے کہ کسی وقت بھی کفار کا کسی دار الحرب پر اس سے زیادہ غلبہ نہیں ہوتا۔ اور جو اسلامی رسومات اور شعائر مسلمان یہاں ادا کرتے ہیں وہ صرف ان کی اجازت سے کوئی رعایا مسلمانوں سے زیادہ عاجز نہیں۔ ہنود کو بھی کسی قدر رسوخ حاصل ہے۔ مسلمانوں کو وہ بھی نہیں۔

نمبر ۲: ہندوستان جب کہ مسلمانوں کا ملک تھا (انگریزوں نے اس کو غصب کیا اور دار الحرب بنایا تو انگریزوں کو نکالنا لامحالہ فرض ہوا۔ جواب نمبر ۱ کے بعد اس پر بحث کی حاجت نہیں رہتی۔

نمبر ۳: یعنی آزادئ وطن یا انگریزوں کے اخراج کی کیا صورت ہو، بیشک یہ مسئلہ قابل غور تھا اور زمانہ کی رفتار نے اس کو بہت زیادہ پیچیدہ بنا دیا تھا۔

صورت یہ ہے کہ جب تک ظاہری اسباب کی بناء پر اس درجہ قوت نہ ہو کہ فتح کی امید کی جا سکے۔ شرعی حیثیت سے اقدام کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

اٹھارھویں صدی کے آغاز تک سرفروشوں کی کثرت سامانِ فتح ہوا کرتی تھی لیکن اب توپوں، رائفلوں وغیرہ جدید آلات حرب نے نوجوانوں اور سرفروشوں کے بجائے آلاتِ حرب اور فراہمی سرمایہ پر فتح و شکست کو منحصر کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں ہندوستانیوں سے آلاتِ حرب چھین کر ان کو فنِ سپہ گری سے

قطعاً نابلد کر دیا گیا تھا۔

نمبر ۴: لیکن ان تمام مایوس کن حالات کے ہوتے ہوئے ان حضرات نے ہمت نہ ہاری۔ ایک دوسرا نقشہ جنگ تیار کیا گیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تنظیم کرتے ہوئے دیگر ممالک سے امداد حاصل کی جائے اور ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔

نمبر ۵: پانچواں نمبر یہ کہ وطنی مطالبات اور ملکی ضروریات کے لیے کانگریس میں شریک ہونا جائز ہے یا نہیں؟

یہ وہ مسئلہ ہے جو ۱۸۸۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء تک طے نہیں ہو سکا اور جب تک انگریزی شہنشاہیت ہندوستان پر مسلط ہے ممکن نہیں کہ اس قسم کے مسئلے طے ہو سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ علماء دیانت داری کے ساتھ عدم جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ مگر اصولی غلطی یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو یعنی دارالحرب کو دارالاسلام پر قیاس کیا کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس حیات انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی فرماتی ہے۔

ہجرت کے بعد تک مکہ معظمہ دارالحرب رہا۔ آپ کی مقدس زندگی کا بیشتر حصہ اسی دارالحرب میں گزرا۔ ہندوستان کی سیاست پر بحث کرتے وقت سیرتِ مقدسہ کا یہی حصہ ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔

سیرت مقدسہ کی مبسوط اور مستند کتابوں پر عمیق نظر رکھنے والے حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ قریش کی اندرونی رقابت نے کس طرح ظہور اسلام کے وقت قریش کو دو گروہ میں منقسم کر دیا تھا جن میں سے ایک گروہ جس کے لیڈر ابو طالب تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا۔ حالانکہ اس کے بہت سے افراد آخر تک مسلمان نہیں ہوئے، کیا یہ غلط ہے کہ انگریز کے مقابلہ پر مسلمانانِ ہند کا ہندوؤں سے تعلق وہی نوعیت رکھتا ہے جو مسلمانان مکہ کا قریش کے اس گروہ

کے ساتھ تھا۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب کی پناہ میں نہیں تھے۔ کیا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ابن دغنہ کی پناہ نہیں لی۔ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ ابوطالب کی وفات کے بعد مطعم بن عدی کی پناہ میں نہیں آئے۔ کیا اس عرصہ کے لیے قرآنِ پاک کے یہ احکام نہ تھے۔

(الف) اِتَّبِعْ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ۔	تم اس وحی کی پیروی کرو جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے نازل کی جا رہی ہے اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور مشرکین سے اعراض کرتے رہو۔

(ب) اعراض کی تفسیر دوسری آیت میں وارد ہوئی۔

دَعْ اَذٰاھُمْ وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ۔	ان کی ایذا رسانی سے قطع نظر کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔
کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔	اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز کی پابندی کرو۔
لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ	تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین

اور کیا یہ غلط ہے کہ دارالحرب کے لیے یہ تعلیمات آج تک بدستور قائم ہیں۔ منسوخ نہیں ہوئیں، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو (حجۃ اللہ البالغہ) باب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم تفسیر اتقان۔ سیرت ابن ہشام۔ طبقات ابن سعد وغیرہ۔ مزید توضیحات کے لیے ملاحظہ ہو: رسالہ جواز شرکت کانگریس وازالۂ شکوک۔

بہرحال دلائل کچھ بھی ہوں ہمیں اس وقت امام ربانی رح کا فتوی پیش کرنا ہے دلائل پر بحث کرنا موضوع کلام سے خارج ہے۔

ہندوستان بالتحقیق دار الحرب ہے

مولانا رشید احمد گنگوہی کا آخری فتویٰ

گزشتہ صفحات میں اس فتویٰ کا آخری پیراگراف جو خلاصۂ کلام و فتویٰ پر مشتمل ہے۔ نقل کیا جا چکا ہے۔ فتوے کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ یہ مکمل نقل کیا جائے۔ حضرت گنگوہی رح کا یہ فتویٰ فارسی زبان میں تھا۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی مرحوم نے کیا تھا اور ۱۳۵۲ھ (۲۴-۱۹۲۳ء) میں دیوبند سے "فیصلۃ الاعلام فی دار الحرب و دار الاسلام" کے نام سے شائع کر دیا تھا، اور اب یہ فتویٰ حضرت گنگوہی" کے مجموعۂ افاداتِ عالیہ بہ عنوان "تالیفاتِ رشیدیہ" ادارۂ اسلامیات، لاہور (۱۹۸۷ء) میں شامل ہو کر شائع ہو گیا ہے۔ یہاں صرف اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا۔ فارسی متن اور حواشی بھی ترک کر دیے ہیں۔ فتوے کے اصلی فارسی متن اور اس پر محققانہ حواشی کے لیے تالیفات رشیدیہ سے رجوع کرنا چاہیے۔ (ابو سلمان شاہجہان پوری)

سوال: ۔ حضرات علماء کرام اور مفتیانِ اسلام کی خدمت میں عرض ہے کہ بہت سے احکام شرعیہ اس پر موقوف ہیں کہ دار الاسلام اور دار الحرب میں امتیاز کیا جاوے جیسا کہ حضرات علماء پر مخفی نہیں۔

پس اس مسئلہ میں حضرات علماء عصر کیا فرماتے ہیں کہ بلاد ہندوستان جو آج کل ہر طرح سے نصاریٰ کے تسلط و حکومت میں ہیں۔ احکام شرعیہ میں ان کو دار الحرب قرار دیا جائے گا یا دار الاسلام۔ بینوا توجروا۔

الجواب: ۔ پہلے یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ کسی ملک اور کسی شہر کے دار الاسلام یا دار الحرب ہونے کا مدار اس پر ہے کہ اس پر غلبہ اہلِ اسلام کا ہے یا کفار کا۔ بناء علیہ جو شہر مسلمانوں کے زیر حکومت ہے وہ دار الاسلام کہلائے گا، جیسا کہ جامع الرموز میں ہے:

"دار الاسلام ما يجري فيه حكم امام المسلمين وكانوا فيه آمنين ودار الحرب ما خافوا فيه من الكفرين" (انتهى)

"دار الاسلام وہ ملک ہے جس میں مسلمانوں کے امام کا حکم چلتا ہو، اور مسلمان اس میں مامون ہوں اور دار الحرب وہ ہے جس میں مسلمان کفار سے اپنے جان و مال کا خوف رکھتے ہوں"

اور درِ مختار میں ہے:۔

"سُئِلَ قارئُ الهداية عن البحر الملح امن دار الحرب او دار الاسلام اجاب انه ليس من احد القبيلتين لانه لا قهر لاحد عليه انتهى"

"قاری الہدایہ سے سمندر کے متعلق دریافت کیا گیا کہ وہ دار الحرب میں داخل ہے یا دار الاسلام میں تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ دونوں میں سے کسی میں بھی داخل نہیں کیونکہ اس پر کسی کا (مکمل) قبضہ نہیں ہے"

اس عبارت کے نقل کرنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ کسی ملک کے دار الاسلام یا دار الحرب ہونے کا مدار صرف اسلام یا کفر کے غلبہ پر ہے، اور اگرچہ سمندر کے بارہ میں قول راجح یہی ہو کہ وہ دار الحرب میں داخل ہے، لیکن ہر ایسے مقام کو جو اہلِ اسلام و کفار دونوں کا (برابر درجہ میں) مقہور ہو دار الاسلام ہی کہا جائے گا۔ کیوں کہ قاعدہ مشہور "الاسلام يعلو ولا يعلى (یعنی اسلام غالب رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا) اسی کا مقتضے ہے۔ مگر اس مقام کو دار الاسلام اسی شرط مذکور کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بعض حکام اسلام کا قبضہ اور تسلط اس جگہ ہو ورنہ محض اس بنا پر کہ اس ملک میں مسلمان آباد ہیں یا وہ کفار کی اجازت سے شعائر اسلامیہ کو ادا کر سکتے ہیں اس ملک کو دار الاسلام نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ کسی ملک میں محض مسلمانوں کے آباد ہونے اور باذن کفار شعائر اسلامیہ کو ادا کر سکنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی طرح کسی ملک میں کفار کا آباد ہونا یا شعائر کفر کا مسلمانوں کی اجازت یا اُن کی غفلت سے وہاں ظاہر کرنا اس ملک کے دار الاسلام ہونے میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا۔ اس لیے کہ ان دونوں صورتوں میں

غلبہ ان لوگوں کا نہیں پایا جاتا، اور مدار حکم غلبہ ہی ہے، محض وجود یا ظہور پر نہیں۔
یہی وجہ ہے کہ کفار اہل ذمہ، دار الاسلام میں مسلمانوں کی اجازت سے آباد رہتے ہیں اور اپنے شعائر کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مگر دار الاسلام اپنے حال پر دار الاسلام ہی رہتا ہے۔ اسی طرح مسلمان دار الحرب میں جاتے ہیں، اور اپنے شعائر کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ مگر صرف اتنی بات سے وہ ملک دار الحرب ہونے سے خارج نہیں ہو جاتا۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ سے پہلے جب کہ مکہ مکرمہ دار الحرب تھا۔ عمرۂ قضا میں صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور جماعت و نماز و عمرہ وغیرہ شعائر اسلام کو اعلام کے ساتھ ادا فرمایا، اور اتنی بڑی جماعت آپ کے ساتھ تھی کہ کفار کو مقہور و مغلوب کر سکتی تھی۔ چنانچہ (عمرہ قضا سے پہلے) غزوہ حدیبیہ میں اسی قدر لشکر کے ساتھ یہ عزم ہو چکا تھا کہ مکہ معظمہ پر چڑھائی کر دی جائے (مگر پھر جب واقعات کی تحقیق سے حضرت عثمان غنیؓ کے قتل کی خبر غلط ثابت ہوئی تو اس عزم کو چھوڑ دیا گیا۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت اس قدر لشکر اپنے ساتھ رکھتے تھے جو کفار مکہ کو مغلوب کر سکتا تھا) مگر چونکہ یہ (مکہ کا داخلہ) اور شعائر اسلام کا اظہار باذن کفار تھا اس لیے ان تین روز میں مکہ معظمہ کو بحکم دار الاسلام نہیں سمجھا گیا بلکہ وہ بدستور دار الحرب رہا۔ کیونکہ یہ قیام مکہ اور اظہار اسلام اجازت کی بنا پر تھا غلبہ کی بنا پر نہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ قاعدہ کلیہ اس بات میں یہ ہے کہ دار الحرب وہ ہے جو مقہور کفار ہو اور دار الاسلام وہ جو مقہور اہلِ اسلام ہو۔ اگرچہ ایک دار میں دوسرے دار کے لوگ بھی بدوں غلبہ و قہر کے آباد ہوں (مثلاً دار الکفار میں کفار یا دار الحرب میں مسلمان بلا غلبہ و قہر آباد ہوں)۔
اور جس ملک پر دونوں فریق (اہلِ اسلام اور کفار) کا تسلط ہو وہ بھی دار الاسلام ہی سمجھا جائے گا۔ اس قاعدہ اور اصل کلی کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

کیوں کہ تمام مسائل متعلقہ اسی اصل سے نکلتے ہیں، اور اس باب کی تمام جزئیات اسی اصل کلی پر دائر ہیں)۔

دارالحرب پر مسلمانوں کا قبضہ :

اس کے بعد ایک اور بات سُن لینا چاہیے وہ یہ کہ جو ملک اصل سے دارالحرب و دارالکفر تھا۔ پھر مسلمانوں نے اُس پر غلبہ پالیا، اور احکام اسلام کو وہاں جاری کر دیا۔ اُس کے متعلق تمام علماء کا اتفاق ہے کہ وہ ملک اب دارالاسلام ہوگیا۔ کیوں کہ اس میں مسلمانوں کا غلبہ اور قہر متحقق ہو گیا۔ اور اگرچہ کسی حیثیت سے کفار کا بھی کچھ غلبہ وہاں باقی ہو۔ تاہم بحکم الاسلام یعلوا ولا یعلی یہ ملک باتفاق دارالاسلام ہو گیا۔ جیساکہ پہلے اس کو واضح کر دیا گیا ہے، اور اس کے بعد یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اگر مسلمانوں کا داخلہ اور احکام اسلامیہ کا اجراء اس ملک میں غلبہ کے ساتھ نہ ہو تو اس ملک کے دارالحرب ہونے میں کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ ورنہ جرمن اور روس اور فرانس اور چین وغیرہ) جو نصاریٰ یا بت پرستوں کے قبضہ میں ہیں سب کے سب دارالاسلام کہلانے کے مستحق ہو جائیں گے، اور ساری دنیا میں کہیں دارالحرب کا نام و نشان نہ رہے گا۔ کیونکہ تمام ممالک کفار میں مسلمان باذن کفار احکام اسلامیہ کو ادا کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ تمام دنیا کو بحالت موجودہ دارالاسلام قرار دینا بالکل باطل ہے۔

دارالاسلام پر کفار کا قبضہ :

اور جو ملک یا شہر دارالاسلام تھا پھر سب پر کفار نے غلبہ کر لیا۔ اگر وہاں سے اسلام کا غلبہ بالکل زائل ہوگیا تو وہ ملک اب دارالحرب کے حکم میں ہوگیا۔ اور اگر کفار کا غلبہ تو ہُوا مگر بعض حیثیات سے اُس میں اسلام کا غلبہ بھی باقی ہے تو اس کو اب بھی دارالاسلام ہی کہا جائے گا نہ کہ دارالحرب۔ اتنی بات پر سب ائمہ کا اتفاق ہے۔ البتہ اس میں کلام ہے کہ غلبہ اسلام کے بالکل زائل ہو جانے کی حد کیا ہے۔ سو اس میں صاحبین یعنی امام ابو یوسف و محمد رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ جب کفار نے

علی الاعلان احکام کفر کو جاری کر دیا، اور مسلمان اپنے غلبہ وقدرت سے بلا اجازت کفار احکام اسلام کو جاری نہیں کر سکتے تو غلبہ اسلام بالکل مرتفع ہو گیا۔ اور یہ ملک بحکم دار الحرب ہو گیا۔ البتہ اگر دونوں فریق یعنی اہل اسلام و کفار اپنے اپنے احکام کو اپنے اپنے غلبہ اور قدرت سے علی الاعلان جاری کرتے ہوں تو ابھی تک اس سے غلبۂ اسلام بالکلیہ زائل نہیں ہوا، اور اس ملک کو دار الحرب نہیں کہہ سکتے۔ اور جب کہ کفار اپنے احکام کو غلبہ وتسلط کے ساتھ علی الاعلان جاری کرتے ہوں، اور مسلمان بلا اُن کی اجازت کے اپنے احکام علی الاعلان جاری رکھنے پر قدرت نہ رکھیں تو وہاں غلبۂ اسلام بالکل مرتفع اور زائل ہو گیا۔ اور قیاس اسی کا مقتضیٰ ہے جو حضرات صاحبین فرماتے ہیں، کیوں کہ جب کفار اس طرح مسلط ہو گئے کہ احکام کفر اپنے غلبہ سے علی الاعلان جاری کرتے ہیں اور اہل اسلام اس قدر عاجز و مغلوب ہو گئے کہ اپنے احکام جاری نہیں کر سکتے اور احکام کفر کو جو کہ اسلام کے لیے عار اور ننگ ہیں دور نہیں کر سکتے۔ تو اب کون سا درجہ اسلام کا باقی ہے کہ اس ملک کو دار الاسلام کہا جائے۔ بلکہ اس صورت میں تسلط اور غلبۂ کفار انتہا کو پہنچ گیا۔ اور یہ ملک بالفعل دار الحرب ہو گیا۔ آئندہ جو کچھ ہونا مقدر ہے وہ ہو رہے گا۔ مگر اس وقت اس کے دار الحرب اور مقہور کفار ہونے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا اور قدیم دار الحرب کی طرح کفار کا مغلوب و مقہور ہو گیا جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔ لیکن امام اعظم ابو حنیفہؒ نے نظر دقیق سے بطور استحسان کے یہ فرمایا ہے کہ جب تک غلبہ اسلام کے آثار میں سے کوئی چیز پائی جاتی ہے، یا استیلاء کفار میں ایسا ضعف محسوس ہو کہ مسلمانوں پر اس کا زائل کر دینا مشکل نہ ہو۔ اس وقت تک اس ملک پر دار الکفر ہونے کا حکم نہیں کرنا چاہیے۔ اسی بناء پر امام اعظمؒ نے اس ملک کے دار الحرب ہونے کے لیے دو شرطیں زائد فرما دیں۔

شرط اوّل :۔ ایک یہ کہ جس دار الاسلام پر کفار نے تسلط کیا ہے وہ دار الحرب کے ساتھ متصل ہو۔ اس کے اور دار الحرب کے درمیان کوئی ملک یا شہر دار الاسلام

حائل نہ ہو۔ کیوں کہ اس طرح دارالحرب کے ساتھ اتصال اور دارالاسلام سے انقطاع کی وجہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اب یہ ملک پوری طرح سے کفار کے قبضہ میں چلا گیا اور تسلط اور غلبہ اُن کا مستحکم ہو گیا، اور ان کے ہاتھوں سے چھڑانا اس کا مشکل ہو گیا۔

اور یہ مسئلہ اس کی نظیر ہے کہ اگر کفار مسلمانوں کے مال پر استیلاء و تسلط کر لیں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس مال کو اپنے ملک میں لے جا کر مکمل قبضہ کر لیں۔ اس صورت میں تو یہ مال ان کی مِلک میں داخل سمجھا جائے گا۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہنوز اس مال کو اپنے ملک میں نہیں لے گئے اور احراز و قبضہ مکمل نہیں ہوا تو اس وقت تک اس کے مالک کی مِلک اُس سے منقطع نہیں ہوئی، اور کفار کی مِلک میں داخل نہیں ہوا۔ جیسا کہ تمام کتب فقہ میں یہ مسئلہ طے شدہ ہے۔ ہدایہ میں ہے:

"واذا غلبوا علیٰ اموالنا و احرزوھا بدارھم ملکوھا۔ انتھی"	"اور جب کفار ہمارے اموال پر غالب آ جائیں اور ان کو اپنے ملک میں لے جائیں تو وہ ان اموال کے مالک ہو جاتے ہیں"

اور فرمایا ہے:۔

"غیر ان الاستیلاء لا یتحقق الا بالاحراز بالدار لانہ عبارۃ عن الاقتدار علی المحل حالاً و مآلاً"	"مگر استیلاء کفار اس وقت تک متحقق نہیں ہوتا جب تک وہ ان اموال کو اپنے ملک میں نہ لے جائیں کیونکہ استیلاء کی حقیقت یہ ہے کہ کسی محل پر قبضہ بالفعل بھی ہو اور (بظاہر اسباب) وہ قبضہ باقی بھی رہ سکے"

پس اسی طرح اگر کسی زمین یا کسی شہر پر کفار کا استیلاء و مکمل تسلط اس طرح ہو گیا کہ اس کا احراز دارالحرب کے ساتھ ہو گیا، اور احراز کی صورت زمین کے بارہ میں یہی ہو سکتی ہے کہ اس کا اتصال دارالحرب کے ساتھ ہو جاوے اور دارالاسلام سے منقطع ہو جاوے تو اس صورت میں وہ ملک بالکلیہ مقہور کفار ہو گیا، اور جب تک ایسا نہ ہو

تو اس پر استیلاء اہل اسلام باقی سمجھا جائے گا۔ اگرچہ استیلاء وتسلط ضعیف ہی ہو، اور بحکم "الاسلام یعلو ولا یعلی" اس کا مقتضیٰ یہ ہوگا کہ یہ ملک دارالاسلام باقی رہے۔ پس خلاصہ اس شرط کا بھی وہی غلبۂ کفار اور مغلوبیت اہلِ اسلام ہے جو ابتداء میں بطور قاعدہ کلیہ کے بیان کر دیا گیا ہے۔

شرط دوم: امام اعظمؒ کے نزدیک یہ ہے کہ حاکم اسلام نے جو امان مسلمانوں کو بسبب اسلام کے اور کفار رعایا کو بسبب ذمی ہونے کے دے رکھا تھا وہ امان زائل ہو جاوے کہ کوئی شخص اس سابقہ امان کی وجہ سے اب اپنے جان و مال پر مامون نہ رہے۔ یعنی جیسا کہ حاکم مسلم کے امن دے دینے کی وجہ سے سب بے خوف تھے کسی کو اس کی مجال نہ تھی کہ کسی کے جان و مال پر ظلم کرے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا امن بدون حاکم مسلم کے غلبہ اور قوت و شوکت کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس اب یہ امان باقی نہ رہے، بلکہ بے کار ہو جاوے، اور باعث امن صرف وہ امان ہو جو غالب آنے والے کفار اپنے قانون کے موافق دیں۔ پس ظاہر ہے کہ جب تک حاکم مسلم کے امن کی وجہ سے موذی کا خوف رفع ہوتا رہے تو غلبہ و شوکت اس حاکم مسلم کا باقی سمجھا جائے گا۔ اور جب یہ کچھ باقی نہ رہے بلکہ کافرِ متغلب کے امن ہی پر نظر رہ جائے تو امان اوّل زائل ہو گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک علی الاعلان اجراء احکام کفر کے بعد جب یہ دو شرطیں بھی پائی جائیں، اس وقت من کل الوجوہ غلبۂ کفار مانا جائے گا، اور غلبۂ اہل اسلام کو زائل و مرتفع سمجھا جائے گا۔ اس وقت ناچار اس ملک پر دارالحرب ہونے کا حکم کیا جائے گا۔

اہلِ عقل کو اس سے بھی معلوم ہو گیا کہ اس قول کا مدار بھی صرف قہر و غلبہ پر ہے، جس کی توضیح ابتداء میں بضمن قاعدہ کلیہ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد فقہاء کی روایات و عبارات سننی چاہیے کہ ان میں سے بعض سے بندہ کی تقریر مذکور کی دلیل حاصل ہوگی، اور بعض سے اس مسئلہ کے متعلق

روایات کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

عالمگیریہ میں ہے:-

قال محمد فی الزیادات انما یصیر دارالاسلام دارالحرب عند ابی حنیفة بوجوہ احدھا اجراء احکام الکفر علی سبیل الاشتھار وأن لا یحکم فیھا بحکم الاسلام والثانی ان تکون متصلۃ بدار الحرب لا یتخلل بینھما بلدۃ من بلاد الاسلام۔ الثالث ان لا یبقی مسلم اوذمی آمنا بامانہ الاول الذی کان ثابتا قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامہ وللذمی بعقد الذمۃ۔ وصورۃ المسئلۃ علی ثلثۃ اوجہ اما ان یغلب اھل الحرب علی دار من دورنا او ارتد اھل مصر وغلبوا واجروا احکام الکفر او نقض اھل ذمۃ العھد وتغلبوا علی دارھم ففی کل ھذا لا تصیر دارحرب الا بثلث شرائط۔ وقال ابویوسف

"امام محمدؒ نے زیادات میں فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دارالاسلام کا دارالحرب ہونا چند وجوہ پر ہے۔ ایک یہ کہ احکام کفر کا علی الاعلان جاری کرنا اس طور پہ کہ اسلام کے احکام حکم نہ رہیں (یعنی ان کے مطابق فیصلے نہ کیے جائیں)، اور دوسرے یہ کہ وہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہو جاوے۔ اُن کے درمیان کوئی شہر دارالاسلام کا حائل نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی مسلمان اور کوئی ذمی کافر اپنے اُس امان سابق کی ساتھ مامون ومحفوظ نہ رہ سکے جو اُس کو غلبۂ کفار سے پہلے بحیثیت مسلمان ہونے کے یا بحیثیت عہد ذمہ کے حاصل تھا اور صورت دارالحرب بننے کی تین ہیں۔ ایک یہ کہ اہل حرب ہمارے دارالاسلام پر غالب آجائیں۔ دوسرے یہ کہ (معاذ اللہ) کسی شہر کے مسلمان مرتد ہو کر شہر پر غالب آجائیں اور احکام کفر جاری کر دیں۔ تیسرے یہ کہ ذمی کافر جو مسلمانوں کی رعایا بن کر رہتے تھے، عہد شکنی کر کے باغی ہو جاویں اور دارالاسلام پر غالب آجائیں۔ لیکن ان تمام صورتوں میں دارالاسلام

رحمة الله عليه ومحمد رحمة الله عليه بشرط واحد لا غير وهو اظهار احكام الكفر وهو القياس ۔ انتہٰی	اُس وقت تک دارالحرب نہ ہوگا جب تک تین شرطیں (مذکورہ) نہ پائی جاویں۔ اور امام ابویوسفؒ و محمدؒ فرماتے ہیں کہ صرف ایک شرط متحقق ہونے سے دارالحرب کا حکم کردیا جائے گا اور وہ شرط یہ ہے کہ احکام کفر کو علی الاعلان جاری کردیں اور قیاس اسی کا مقتضی ہے۔ آہ

اور جامع الرموز میں ہے :

فاما صیرورتها دارالحرب فعنده بشرائط احدها اجراء احکام الکفر اشتهارًا بان یحکم الحاکم بحکمهم ولا یرجعون الی قضاة المسلمین کما فی البحر و الثانی اتصال بدارالحرب بحیث لا یکون بینهما بلدة من بلاد الاسلام ما یلحقهم المدد منها الخ	"لیکن دارالاسلام کا دارالحرب ہوجانا سو یہ امام اعظمؒ کے نزدیک تین شرطوں پر موقوف ہے، ایک اجراء احکام کفر علی الاعلان اس طرح کہ حکام وقت کفار کے حکم کو جاری کریں اور لوگ مسلمان قاضیوں کی طرف مراجعت نہ کرسکیں جیسا کہ بحرالرائق میں مذکور ہے، دوسرا اس کا دارالحرب کے ساتھ ایسا متصل ہوجانا کہ کوئی شہر اسلامی شہروں میں سے درمیان میں حائل نہ رہے جس سے مسلمانوں کو مدد پہنچ سکے۔"

جامع الرموز کی اس روایت سے دو امر واضح ہوئے، اول یہ کہ احکام اسلام کے جاری کرنے سے مراد یہ ہے کہ غلبہ اور قوت کے ساتھ احکام اسلام جاری کیے جائیں (نہ کہ مطلقاً ادائے جماعت و جمعہ باذنِ کفار) کیوں کہ جامع الرموز کی عبارت یں ہے : یحکم بحکمهم ولا یرجعون الی قضاة المسلمین ۔یعنی قضاۃ مسلمین کو کسی قسم کی شوکت و قعت نہ رہے کہ لوگ ان کی طرف رجوع کرسکیں ۔ اسی طرح

مسلمانوں کا دارالحرب میں احکام اسلام کا جاری کرنا اُسی صورت میں اس کو دارالاسلام بنا سکتا ہے جب کہ یہ اجرا اور احکام علی الاعلان اپنے غلبہ و تسلط کے ذریعہ ہو جیسا کہ بالکل ظاہر ہے۔

بہرحال حکم اسلام اور حکم کفر دونوں بطریق غلبہ معتبر ہیں نہ کہ محض ادا بطریق اظہار۔

دوسری بات جامع الرموز کی عبارت سے یہ مستفاد ہوئی کہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہونے کی جو شرط امام صاحبؒ کے نزدیک ضروری ہے، اس کا مطلب بھی وہی قوت و غلبہ ہے۔ کیونکہ دارالحرب کے ساتھ متصل ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کو مدد نہیں پہنچ سکتی ہے بخلاف اُس صورت کے کہ دارالحرب سے انقطاع ہو تو مسلمانوں کو استخلاص دارالاسلام میں پہنچنے کا احتمال قریب ہے۔ اس لیے ابھی تک قوت اسلام کو باقی سمجھا جائے گا۔

اور خزانۃ المفتین میں ہے کہ کوئی دارالاسلام اس وقت تک دارالحرب نہیں بن سکتا جب تک کہ اس میں احکام کفر علی الاعلان جاری نہ ہو جائیں، اور وہ ملک دارالحرب کے ساتھ متصل نہ ہو جائے کہ اس کے اور دارالحرب کے درمیان کوئی شہر بلاد مسلمین میں سے باقی نہ رہے، اور یہ کہ کوئی مسلمان یا ذمی رعایا امان سابق کے ساتھ اب مامون و محفوظ نہ رہ سکے۔ بلکہ ہر مسلمان اور ذمی کو اس ملک میں بسر کرنا بغیر امان دینے کفار کے نہ ہو سکے۔ الخ

اور فتاویٰ بزازیہ میں ہے سید امامؒ فرماتے ہیں کہ آج کل جو شہر کفار کے قبضہ میں ہے بلاشبہ وہ ابھی تک دارالاسلام ہیں کیوں کہ ان میں احکام کفر ظاہر نہیں ہوئے بلکہ قضاۃ و حکام وہاں مسلمان ہیں۔ تو اب یہ دیکھنا چاہیے کہ عبارت مذکورہ میں ان شہروں کے دارالاسلام ہونے پر یہ دلیل لاتے ہیں کہ حکام و قضاۃ وہاں مسلمان ہیں جس کی وجہ سے احکام اسلام ان میں بدستور سابق باقی ہیں۔ دلیل میں یہ نہیں فرمایا کہ لوگ یہاں نماز پڑھتے ہیں اور جمعہ قائم کرتے ہیں۔ کیوں کہ اجرائے احکام سے مراد وہی اجراء ہے جو بطور غلبہ و شوکت کے ہو، نہ یہ کہ اپنے دین کے مراسم و شعائر

کو حاکم کافر کی رضا و اجازت سے ادا کیا جائے۔ اور درمختار میں ہے:

"معراج الدرایہ میں بسوط سے نقل کیا ہے کہ وہ شہر جو کفار کے قبضہ میں ہیں، دارالاسلام ہیں۔ دارالحرب نہیں کیوں کہ انھوں نے ان شہروں میں احکام کفر جاری نہیں کیے بلکہ وہاں ایسے حکام اور قاضی موجود ہیں جن کو مسلمانوں نے منتخب کر کے حاکم بنایا ہے اور وہ اُن کی بضرورت و بلاضرورت اطاعت کرتے ہیں۔ اور ہر ایسا شہر جس میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی والی مقرر ہو اُس کے لیے اقامت جمعہ وشعائر اسلامیہ اور حدود و قصاص اور احکام و قضاۃ کا مقرر کرنا سب جائز ہیں۔ کیوں کہ ان پر امیر مسلم حاکم ہے اور اگر خود کفار ہی نے کسی مسلمان کو حاکم بنا دیا تب بھی مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ اُس کی زیر حکومت جمعہ وغیرہ قائم کریں، اور مسلمانوں کے اتفاق و راضی سے قاضی بن سکتا ہے۔ اور (دارالحرب کے) مسلمانوں پر واجب ہے کہ کوئی والی مسلم تلاش کریں (اور اپنے معاملات کا رجوع اس کی طرف کریں) انتہی۔"

اور اسی معراج الدرایہ میں ہے کہ میں کہتا ہوں کہ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ملک شام میں جو پہاڑ "ایتم اللہ" اور اس کے متعلقہ بعض شہر ہیں سب کے سب بلاد اسلام ہیں کیوں کہ ان کے حکام اگرچہ قوم دروز یا نصاریٰ ہیں لیکن وہ سب ہمارے مسلم حکام کے تابع ہیں اور اُن کی طرف سے قضاۃ و حکام مقرر ہیں، اور چاروں طرف سے بلاد اسلام اُن کے اس طرح محیط ہیں کہ جب ہمارے حکام دادلوالا مرچاہیں تو وہاں اپنے احکام نافذ کر سکتے ہیں۔ انتہی۔

ان دونوں روایتوں سے واضح ہو گیا کہ غلبہ کفار کے بعد کسی ملک کے دارالاسلام باقی رہنے کے لیے جو اجراء احکام اسلام شرط ہے، اس سے یہی مراد ہے کہ بطریق غلبہ و شوکت احکام اسلام جاری ہو سکتے ہوں۔ اسی طرح دارالحرب میں احکام اسلام کا اجراء جب اُس کے دارالحرب ہونے کو زائل کر سکتا ہے جب کہ یہ اجراء احکام بطریق غلبہ و قوت ہو نہ یہ کہ دارالحرب کا حاکم اپنی اجازت سے احکام اسلام جاری کرا دے۔

حاصل یہ ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک مذکورہ سابقہ تین شرطوں سے اور صاحبین رحمہ کے نزدیک شرط واحد یعنی اجراء احکام اسلام سے مقصود ایک ہی چیز ہے، یعنی وجود غلبہ و قوت اگرچہ بعض وجوہ سے ہو۔ لیکن علماء اسلام میں کوئی شخص بھی اس کا قائل نہیں کہ کفار کے ملک میں اگر کوئی شخص اُن کی صریح اجازت سے یا اُن کی چشم پوشی کی وجہ سے شعائر اسلام کا اظہار کرے تو یہ ملک دارالاسلام ہو جائے گا۔ حاشا و کلا۔ کیونکہ ایسا خیال بالکل تفقہ سے دُور ہے۔

حالتِ ہندوستان :- اور جب یہ مسئلہ (کلی طور پر) متحقق ہو چکا تو اب ہندوستان کی حالت پر خود غور کر لیں کہ اس جگہ کفار نصاریٰ کے احکام کا اجراء کس قوت و غلبہ کے ساتھ ہے کہ اگر کوئی ادنیٰ کلکٹر یہ حکم کر دے کہ مساجد میں جماعت ادا نہ کرو تو کسی امیر و غریب کی مجال نہیں کہ ادا کر سکے۔ اور یہ جو کچھ ادائے جمعہ و عیدین اور عمل (بعض) قواعد شرعیہ پر جو کچھ ہو رہا ہے محض ان کے قانون کی وجہ سے کہ انھوں نے یہ حکم جاری کر دیا ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے مذہب میں آزاد ہے، کسی کو اُس سے مزاحمت کا حق حاصل نہیں۔

اور سلاطینِ اسلام کا دیا ہُوا امن جو یہاں کے رہنے والوں کو حاصل تھا اب اُس کا کہیں نام و نشان نہیں۔ کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ ہمیں جو امن شاہ عالم نے دیا ہوا تھا آج بھی ہم اُسی امن کے ذریعے مامون بیٹھے ہوئے ہیں۔ بلکہ امن جدید کفار سے حاصل ہوا ہے، اور اسی نصاریٰ کے دیے ہوئے امن کے ذریعہ تمام رعایا ہندوستان میں قیام پذیر ہے۔ لیکن اتصال بدارالحرب سو یہ ممالک و اقالیم عظیمہ کے لیے شرط نہیں بلکہ گاؤں اور شہر وغیرہ کے لیے شرط ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہاں سے مدد پہنچنا آسان ہے، اور اگر کوئی کہے کہ اگر شاہ کابل یا شاہ روم کی طرف سے مدد پہنچ جائے تو کفار کو ہندوستان سے نکال سکتے ہیں مگر حاشا و کلا یہ بالکل صحیح نہیں بلکہ ان کا اخراج ہندوستان سے سخت مشکل ہے، بہت بڑے جہاد اور عظیم الشان سامانِ جنگ کو چاہتا ہے۔ بہرحال تسلط کفار کا ہندوستان پہ اس درجہ میں ہے کہ کسی وقت

بھی کفار کا تسلط کسی دارالحرب پر اس سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور شعائر اسلامیہ جو مسلمان یہاں ادا کرتے ہیں وہ محض اُن کی اجازت سے ہے، ورنہ مسلمانوں سے زیادہ عاجز رعایا کوئی نہیں ہے۔ ہندوؤں کو بھی ایک درجہ کا رسوخ حکومت میں حاصل ہے، مسلمانوں کو وہ بھی نہیں۔ البتہ ریاست ٹونک اور رامپور اور بھوپال وغیرہ کہ وہاں کے حکام باوجود مغلوبِ کفار ہونے کے اپنے احکام کو جاری رکھتے ہیں، ان کو دارالاسلام کہا جا سکتا ہے جیسا کہ درمختار وغیرہ کی روایات سابقہ سے مستفاد ہوتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

بندہ رشید احمد گنگوہی

الحمد للہ والمنۃ کہ رسالہ دارالحرب کا ترجمہ اردو تمام ہوا، حق تعالیٰ اس کو بھی اصل کے ساتھ مقبول و نافع فرمائے آمین۔ والحمد للہ بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات۔

بندہ محمد شفیع دیوبندی عفا اللہ عنہ

